egd. L. No. 7243

Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1968ء

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

بزم لائل پور

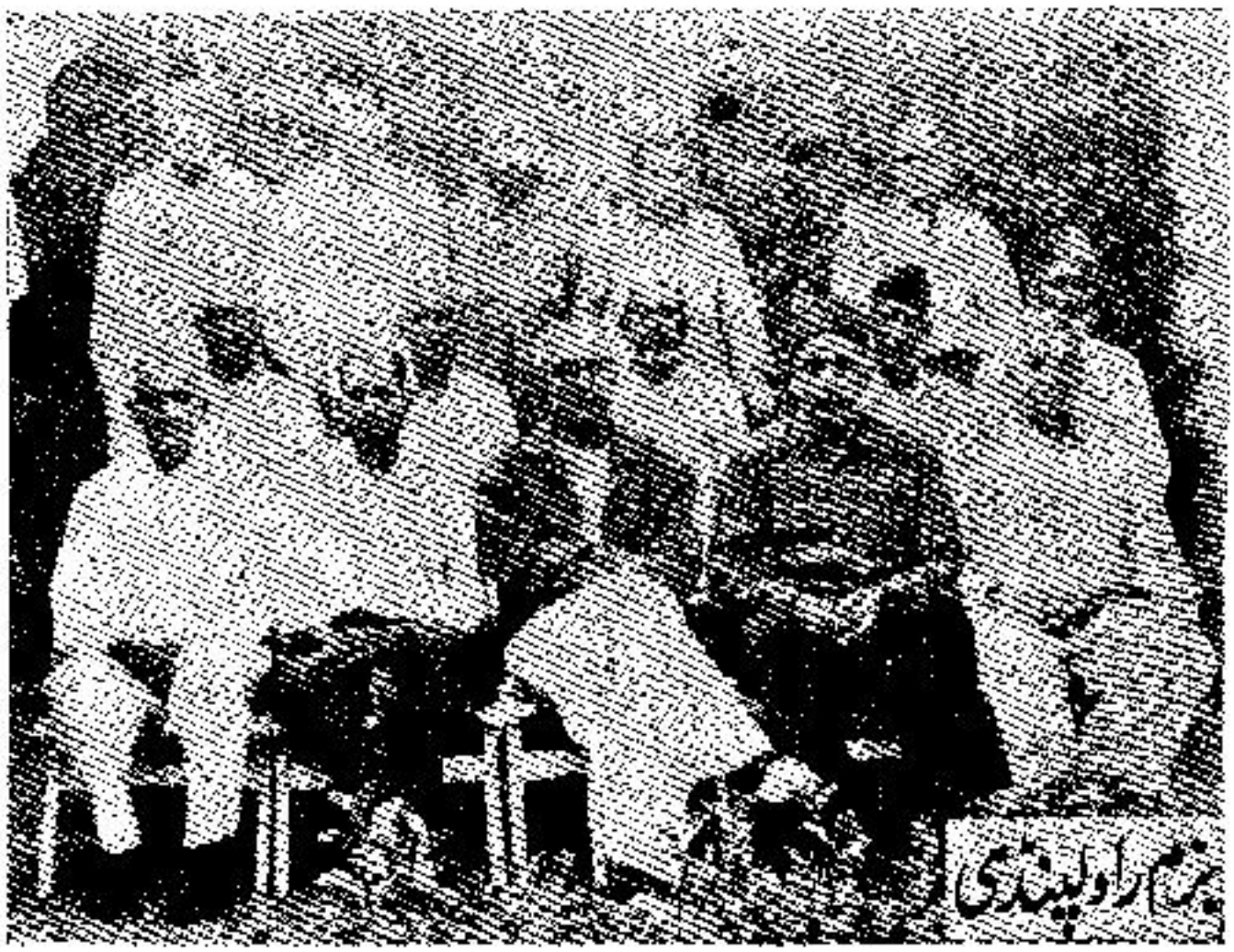
بزم راولپنڈی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت	پاکستان : ایک روپیہ	سالانہ ـــــ پاکستان ـــــ دس روپے
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام	ہندوستان	سالانہ ـــــ ہندوستان ـــــ پندرہ روپے
۲۵ بی، گلبرگ، لاہور	ڈیڑھ روپیہ	سالانہ ـــــ غیر ممالک ـــــ ایک پونڈ

جلد (۲۱) دسمبر ۱۹۶۸ء نمبر (۱۲)

فہرست

۱۔ لمعات ـــــ ۲

۲۔ حقائق و عبر (مرتد کی سزا، مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ) ـــــ ۹

(گناہ کی تلافی ـ انفرادی ـ لاہوری حضرات سے ایک سوال) ـــــ (ہماری تاریخ)

(تفسیرِ قرآن میں اجتہاد کی گنجائش) ـــــ (آہ ہمارے بچے)

(ایک خوش نتیجہ فیصلہ) ـــــ

۳۔ جہانے دگر ست ـــــ (محترم پرویز صاحب) ـــــ ۱۷

۴۔ بزمِ مذاکرہ ـــــ ۳۵

"نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر"

(i) محمد مسعود ـــــ ۳۶

(ii) ثریا عندلیب ـــــ ۳۸

(iii) عفت خلیل ـــــ ۴۲

(iv) مسرت چغتائی ـــــ ۴۶

(v) غزالہ خان ـــــ ۵۰

(vi) سلمیٰ خلیل ـــــ ۵۴

(vii) عارفہ سلطانہ ـــــ ۶۳

(viii) نجمہ کوثر ـــــ ۷۱

(ix) سلمیٰ پرویز ـــــ ۷۳

(x) ارشاداتِ صدرِ مذاکرہ ـــــ ۷۵

۵۔ باب المراسلات ـــــ (ایک نہایت اہم سوال) ـــــ ۷۸

۶۔ نقد و نظر ـــــ ۷۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵ بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

الاماں از جعفرانِ ایں زماں!

دینِ خداوندی نے انسانی ہئیتِ اجتماعیہ کے لئے ایک بنیادی اصول دیا۔ یعنی یہ اصول کہ جو لوگ ایک آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم کریں وہ ایک ملت، ایک امت، ایک قوم کے افراد۔ جو اس آئیڈیالوجی سے اختلاف کریں وہ دوسری قوم سے متعلق۔ قرآن کے الفاظ میں اسے یوں کہیں گے کہ قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہے۔ نسل، زبان، رنگ، وطن، جغرافیائی وحدت نہیں۔ یگانگت اور بیگانگی کا یہی وہ ازلی معیار تھا جس کی رُو سے (حضرت) نوح ؑ کے بیٹے کے متعلق کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان کے اہل میں سے نہیں، اور (حضرت) لوطؑ کی بیوی کے متعلق اعلان ہو گیا کہ وہ اپنوں میں سے نہیں غیروں میں سے ہے۔ یہی وہ معیار تھا جس کے مطابق، حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے باپ، اور ساری قوم سے برملا کہہ دیا کہ نہ میں تم میں سے ہوں، نہ تم مجھ میں سے ہو۔ میرے وہ ہیں جو میری آئیڈیالوجی کے ہم نوا ہیں۔ اور یہی وہ معیار تھا جس کی رُو سے حضور خاتم النبیین ؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جس میں، روم کا صہیب ؓ، حبش کا بلال ؓ اور فارس کا سلمان ؓ تو ایک برادری کے افراد تھے، لیکن ابوجہل و ابولہب، نسل، رنگ، زبان، وطن کے اشتراک کے باوجود (حضرت) محمدؐ کی قوم کے افراد نہیں تھے۔

قرآن نے اس ازلی معیار کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا۔ اور نبی اکرمؐ نے اسے اس طرح عملی پیکر عطا فرمایا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد امتِ مسلمہ نے اس عظیم اصول کو فراموش کر دیا اور پھر عہدِ جاہلیہ کی طرح، بتانِ رنگ و بو کی پجاری بن گئی۔ مسلمان صدیوں سے اس روشِ جاہلیت کا متبع چلا آ رہا تھا کہ تیرہ سو سال کے بعد ظلمتکدۂ ہند سے یہ آواز بلند ہوئی کہ ـــــ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ـــــ اس زمانے میں جب ساری دنیا، وطن کی بنیادوں پر قومیت کو ایک مسلّمہ حقیقت سمجھے ہوئے تھی، اس قسم کی آواز بڑی تحیّر انگیز اور انقلاب آفریں تھی ـــــ ہندوستان کی اُس زمانے کی سیاست کے پیشِ نظر، ہندو اس نعرۂ قومیت میں بڑے خطرات مضمر دیکھتا تھا۔ یہی

وہ معیارِ قومیت تھا جس کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے تھے اور یہی وہ جداگانہ قوم تھی جو اپنے لئے ایک جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر رہی تھی۔ یہ مطالبہ کوئی سیاسی حربہ نہیں تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا تھا۔ یہ دین کا منطقی نتیجہ تھا۔

اس مطالبہ (یا معیارِ قومیت) کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے تو ہوتی تھی لیکن مقامِ حیرت ہے کہ اس کی مخالفت خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی طرف سے بھی ہوئی۔ ان میں نیشنلسٹ علماء بھی شامل تھے اور وہ "مسلمان" بھی جو مذہب سے سخت متنفر تھے۔ (مثلاً) جوش ملیح آبادی، وطنی قومیت کے بہت بڑے حامی تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ماہنامہ کلیم کی دسمبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی؟ قومیت تو ہمارا گوشت، پوست اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کرنا طاقتِ بشری سے باہر ہے[1]

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ان حضرات کا یہ نظریہ قومیت، درحقیقت مذہب سے ان کی نفرت کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ جوش صاحب نے اسی ماہنامہ کی نومبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

> عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ، معاذ اللہ ـــــ طلوع اسلام) حسرت ناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے صاف الفاظ میں یہ کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کسقدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان یہ ہے کہ خدا نے انبیاءؑ کے ذریعے نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں انبیاء مبعوث فرماتے تھے، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے نہ طلب فرمایئے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستے پر گامزن ہے۔

---

[1] اس سے واضح ہے کہ جوش صاحب جو ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان آ چکے ہیں تو ان کی قومیت بدستور "ہندوستانی" ہے۔ کیونکہ قومیت کا بدلنا ان کے عقیدہ کی رُو سے "طاقتِ بشری سے باہر ہے"۔

یہ خیالات ترجمانی کرتے ہیں ان لوگوں کی جو وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے اصول کے حامی تھے۔

ان لوگوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا۔ اس کے وجود میں آتے ہی (یعنی تقسیم ہند کے ساتھ ہی) اکثر لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اس اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آگیا ہے جس کے قیام کے لئے مطالبۂ پاکستان پیش کیا گیا تھا لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ تقسیم ہند سے ایک اسلامی مملکت وجود میں نہیں آگئی تھی۔ اس سے ہمیں صرف ایک خطۂ زمین مل گیا تھا جس میں اسلامی مملکت قائم کی جا سکتی تھی ـــــ واضح رہے کہ اسلامی مملکت خود بخود قائم نہیں ہو جایا کرتی، یہ مسلمانوں کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے بتدریج وجود میں آیا کرتی ہے۔ یہ خطۂ زمین تو ہندوستان سے الگ ہو گیا لیکن نظامِ مملکت یہاں وہی منتقل ہو کر آگیا جو قبل از تقسیم ہندوستان میں رائج تھا۔ اس نظامِ مملکت میں، مملکت کے تمام شہریوں (CITIZENS) کو ایک قوم تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس لئے پاکستان میں بھی جملہ اہل پاکستان کو پاکستانی قوم کے افراد شمار کر لیا گیا۔ یہ اسلامی معیارِ قومیت نہیں تھا، سیکولر معیار تھا۔ اس سے (کم از کم) ان لوگوں کو مطمئن ہو جانا چاہیئے تھا جو قبل از تقسیم سیکولر معیار (یعنی ایک مملکت کے حدود کے اندر بسنے والے تمام افراد کے ایک قوم کے اجزاء تصور کئے جانے کے اصول) کے حامی تھے اور پاکستان میں آچکے تھے۔ لیکن بعد کے حالات نے بتایا کہ ان حضرات میں بیشتر ایسے تھے جو مطالبہ پاکستان کی مخالفت معیارِ قومیت کے اختلاف کی بنا پر نہیں کرتے تھے۔ وہ دل سے چاہتے ہی نہیں تھے کہ مسلمانوں کی ایک ایسی الگ مملکت قائم ہو جائے جس میں اسلام بطور نظامِ حیات رائج ہو سکے۔ یعنی یہ لوگ جو مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے، تو اس کا جذبۂ محرکہ خود اسلام کے خلاف ان کا جذبۂ نفرت تھا۔ چنانچہ یہ لوگ پاکستان میں آجانے اور یہاں بس جانے کے باوجود، اس قسم کی تخریبی کوششوں میں لگے رہتے ہیں جن سے یہ مملکت مستحکم نہ ہونے پائے۔ اس قسم کی مذموم کوشش کے لئے سب سے مؤثر حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس مملکت کے افراد میں اتحاد کی جگہ تفرقہ اور سالمیت کی جگہ انتشار پیدا کیا جائے۔ اس اسلام دشمن طبقہ کی اس قسم کی تخریبی کوششوں کی تازہ ترین مثال وہ تحریک ہے جو "عوامی ادبی انجمن" کے پردے میں وجود کوش ہوئی ہے اور جس کی تفصیل اس پمفلٹ میں درج ہے جس کے صفحہ اول پر اس قسم کے چودہ پندرہ حضرات کے دستخط ثبت ہیں۔ ان میں جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے نام ایسے ہیں جن سے اہل پاکستان اچھی طرح متعارف ہیں (جوش نے اپنے دستخطوں کے ساتھ "مرحوم" بھی لکھا ہے[1])۔ دیکھئے۔ اور غور سے دیکھئے کہ اس پمفلٹ میں کس خیال کو ابھارا جا رہا

---

[1] کہتے ہیں کہ جوش صاحب نے بعد میں اپنے دستخطوں سے رجوع کر لیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکے کہ ـــــ در کفر ہم پختہ ای و زنار را رسوا مکن ـــــ لیکن ان کی اس رجعت سے اسلام کے خلاف جو ان کی نفرت شروع سے چلی آرہی ہے، وہ تو مٹ نہیں سکتی۔

ہے۔ لکھا ہے۔

> ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے، وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں، کسی ایک قوم کے اثر اور تسلط سے آزاد ہو کر، خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ اس لئے ہم ادیب تمام قوموں کے لئے یکساں داخلی خود مختاری۔ ان کی زبانوں کے لئے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں ..... ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ یہ تحریک کس قدر شر انگیز اور خطرناک نتائج کی حامل ہے۔ ہندوستان میں جب مسلمانوں کا دعوٰے یہ تھا کہ وہاں کے مسلمان بر بنائے اسلام، ایک قوم ہیں، تو یہ حضرات اس دعوٰے کی مخالفت یہ کہہ کر کرتے تھے کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ ایک مملکت کی حدود (TERRITORY) کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم بنتے ہیں۔ اب پاکستان میں جب، مملکت پاکستان میں بسنے والے افراد کو ایک قوم کہا گیا ہے۔ تو یہ حضرات اس خیال کو لے کر آگے بڑھے ہیں کہ اس مملکت میں ایک قوم نہیں بستی۔ یہاں بہت سی قومیں بستی ہیں کیونکہ یہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یعنی اب اِن لوگوں کے نزدیک، قومیت کا معیار، نہ آئیڈیالوجی ہے نہ مملکت، بلکہ زبان ہے۔ اس معیار کی رُو سے سوچئے کہ پاکستان کتنے ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے؟ یہاں پہلے، مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا فتنہ کھڑا کیا گیا، پھر پختونستان کا فریب انگیز نظریہ آگے بڑھایا گیا۔ اُدھر سے "جے سندھ" کی للکار سنائی دینے لگی اور اِدھر سے "مختلف قوموں" کی چنگاری پھینک دی گئی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کی تخریبی سازشوں کے پیچھے ہر جگہ وہی لوگ ہیں جو تحریکِ پاکستان کے دوران، مطالبہ پاکستان کے مخالف تھے ـــــ پاکستان بن گیا۔ ان لوگوں کو پاکستان میں ہر طرح کی سہولتیں اور آسائشیں میسر آگئیں۔ انہیں یہاں کے معزز شہری تسلیم کر لیا گیا اور مساوی حقوق دیئے گئے۔ پاکستان نے ان کے ساتھ یہ کیا، لیکن انہوں نے ابھی تک پاکستان کو اپنایا ہی نہیں جس طرح ہندوؤں کے دل میں اب تک اکھنڈ ہندوستان کی آگ سلگ رہی ہے، اسی طرح یہاں بھی، یہ لوگ، پاکستان کی جداگانہ حیثیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ کسی مملکت کے باشندوں کے دل میں، علاقائی، نسلی، یا لسانی بنیادوں پر جداگانہ قومیت کے تصور کو بیدار کرنا، باہمی نفرت کا بیج بونا اور مملکت کی سالمیت کو مخدوش کرنے کی سعیِ مشئوم ہے۔ اور یہی خواہانِ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسی سازشوں کو اُبھرنے نہ دیں۔ ملک میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی ملّی وحدت اور یک جہتی کے لئے کچھ کم مضرت رساں نہیں۔ لیکن مملکت کے اندر، لسانی یا علاقائی بنیادوں پر مختلف قوموں کا تصور، مملکت کے وجود ہی کو ختم کر دیتا ہے۔ خدا اس مملکت کو

اس قسم کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔

جہاں تک ملی وحدت اور یکجہتی کا تعلق ہے ہم خود حکومت کی توجہ بھی اس کے ایک ایسے اقدام کی طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتے ہیں جو اس وحدت کو کمزور کرنے کا موجب بن رہا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان اسقدر بُعدِ مکانی کے باوجود ایک مملکت کے حصے ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں۔ مغربی پاکستان میں مختلف صوبوں کا وجود اس اتحاد کے راستے میں بہت بڑا روڑا تھا۔ ون یونٹ نے راستے کی اس رکاوٹ کو بھی دور کر دیا اور حکومت کا یہ اقدام بڑا مستحسن تھا۔ لیکن علاقائی بنیادوں پر ملازمتوں میں مخصوص حصہ (QUOTA) کا اصول ان امتیازی خطوط کو ہر وقت زندہ رکھتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صوبائی تفریق کے سانپ کے نکل جانے کے بعد اس کی لکیروں کو اس طرح نمایاں رکھنا وحدتِ مملکت کے تصور کو دھندلا دیتا ہے۔ اگر مقصد پسماندہ علاقوں کے باشندوں کو پیشرو باشندوں کے ہم دوش کھڑا کرنا ہے تو اس کے لئے تعلیم اور نشوونما کے دیگر شعبوں میں خصوصی مراعات دی جا سکتی ہیں۔ ملازمتوں میں اس قسم کی تخصیص نہ صرف حکومتی کارکردگی کے معیار پر مضر اثر ڈالتی ہے بلکہ باہمی تفریق کی خلش کو بھی ہر وقت بیدار رکھتی ہے۔ ایسے معاملات میں ساری مملکت کو ایک وحدت تصور کرنا چاہیئے۔ اسی سے (ہمارے عہدِ غلامی کے) صوبائی ـــ لہٰذا، نسلی اور علاقائی ـــ امتیازات کی یاد ذہنوں سے محو ہو سکے گی۔ حریمِ کعبہ سے بتوں کو نکال کر ان کے استھانوں کو برقرار رکھنا دلوں پر نقشِ توحید کے مرتسم ہونے میں بہرحال مانع ہوتا ہے۔

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا!

(۰)

عوامی ادبی انجمن کے زیرِ نظر پمفلٹ میں ایک اور نقطہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس میں بڑی معصومیت سے کہا گیا ہے کہ

ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کی بقا اور ترقی کا انحصار عالمی امن پر ہے اور علم و ادب اور فکر و فن کے پودے جنگ کے زہریلے ماحول میں بارآور نہیں ہو سکتے۔ ہماری رائے میں دنیا کے تمام نزاعی مسائل خواہ وہ سیاسی اور معاشی ہوں یا انسانی اور تہذیبی ہوں، باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل ہو سکتے ہیں۔ ملکوں اور قوموں کو باہمی منافرت اور جنگ پر اکسانے والوں کو ہم امن کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اسلئے ہم انسان کو انسان کے قریب لانے اور ملکوں کے درمیان مفاہمت اور دوستی بڑھانے کی تمام کوششوں کا خیر مقدم کرتے ہیں بشرطیکہ یہ کوششیں آزادی، جمہوریت اور قوموں کے حقِ خود ارادیت

کے اصول پر مبنی ہوں۔

یہ اُسی اہنسا (عدم تشدد) کا پرچار ہے جس کا اپدیشک ' ہندو جاتی کے مہاتما گاندھی ' ہاتھ میں رام نام کی مالا لئے لیکن آستین میں خنجر چھپائے دیا کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اپنے پاس چاقو بھی نہ رکھو کہ اس سے ہنسا (تشدد) کی بُو آتی ہے لیکن ہندو عورتوں تک کو تاکید کیا کرتے تھے کہ پستول سے نشانہ بازی سیکھو۔ ہم عوامی ادبی انجمن کے ان پرچارکوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی بڑی مملکت ' محض اپنی قوت کے زور پر ' عدل و انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر کسی کمزور قوم کی آزادی چھیننے کے درپے ہو ' اور گفت و شنید کے ذریعے معاملہ کے حل کی تمام کوششوں کو مسترد کرتے ہوئے ' دھاندلی پر اُتر آئے تو اُسے اس ظلم و تشدد اور سلب و نہب سے روکنے کے لئے ' اس کمزور قوم یا اس کے حمایتیوں کے لئے جنگ کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ حضرات اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور قرآن پر ان کا ایمان ہے ' تو ہم ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ قرآن کی رُو سے ' ظالم کو اس کے ظلم سے روکنے کے لئے ' بطور آخری تدبیر ' جنگ نہ صرف جائز ہوتی ہے بلکہ فرض ہو جاتی ہے۔ اسلام ' امن کا پیامبر اور سلامتی کا سب سے بڑا داعی ہے ——— سلامتی تو خود اس کے نام میں مضمر ہے ——— لیکن وہ اہنسا جیسے ناممکن العمل اور سطحی جذبہ کی رو میں نہیں بہہ جاتا۔ وہ حقائق کا سامنا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا میں قیام امن و سلامتی کی خاطر بعض اوقات ' مستبد قوتوں کے خلاف جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی جنگ میں حصہ لینے والوں کو وہ شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز کرتا ' اور اس میں جان دینے والوں کو حیات ابدی سے ہمکنار قرار دیتا ہے۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم ' اور وہ ہے اہنسا کا منافقت آمیز آدرش جس کی صدائے بازگشت عوامی ادبی انجمن کے پمفلٹ کے ذریعے عام کی جا رہی ہے۔ پاکستان کے دودھ پر بھی کیسے کیسے خوش رنگ سانپ پل رہے ہیں۔

——————— (۲) ———————

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ ' حریت ' کا ہفتہ وار ایڈیشن — حریت میگزین — (مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۶۸ء) ...... آیا۔ اور اس میں جو کچھ لکھا دیکھا اس سے جگر شق ہو گیا۔ (سابق) سندھ میں اس وقت ' محمد بن قاسم کے خلاف اور راجہ داہر کی حمایت میں ' نیز جی۔ ایم۔ سید ' ' سندھ ' کے نعرہ کے ضمن میں جو کچھ کہا جا رہا ہے ' ایک صاحب ' عبدالکریم عابد ' اس کی تردید میں مسلسل مضامین لکھ رہے ہیں۔ ان مضامین کے ردعمل کے طور پر حریت میگزین وہ خطوط شائع کر رہا ہے جو اسے قارئین کی طرف سے موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں کے (بالخصوص) نوجوان طبقہ کے دل میں کس قسم کے خیالات پرورش پا رہے ہیں۔ مثلاً ان میں سے نسیم تھلا اپنے خط میں لکھتی ہیں۔

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے ' ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم

اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جوداڑو، کوٹ ڈیجاں کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ ایم۔ سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔

یہ الفاظ یقیناً ایسے ہیں جن سے ہر حساس سینے سے ہوک اُٹھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نوجوانوں کے دل میں اس قسم کے خیالات اُبھرنے کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ہے وہ غلط تعلیم جو بیس برس سے ہمارے نوجوانوں کو دی جا رہی ہے اور جس کی وجہ سے نہ اُنہیں اس بات کا علم ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں، پاکستان سے مراد و مقصود کیا ہے۔ اور نہ ہی یہ معلوم کہ عظمت کا معیار کیا ہے۔ اور پھر اس کی ذمہ دار ہے ہماری یہ حماقت جس کی وجہ سے ہم موہن جوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کو پاکستانی کلچر کے مراکز قرار دیتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ جس کلچر کے آئینہ دار یہ مقامات ہیں اُسے اسلام اور پاکستان سے تعلق کیا ہے۔ کیا ان کا کلچر محض اس بنا پر پاکستان کا کلچر بن گیا ہے کہ جن علاقوں میں یہ کھنڈرات پائے جاتے تھے وہ (تقسیم ہند کے وقت) اتفاق سے پاکستان کی حدود میں واقع تھے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں صحیح نظامِ تعلیم رائج کریں؟

(۰)

انسانی مسائل کے حل میں

— عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔
تاریخِ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صرف پرویز صاحب کی مشہور کتاب

اِنسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ، افلاطونِ اعظم سے لیکر آج تک گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں
دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات
نے کیا سوچا؟
اسے پڑھیئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے
اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا!

قیمت
بارہ روپے ۱۲

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ لاہور

حقائق و عبر

۱۔ مرتد کی سزا (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)

ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی چلا آرہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان، اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرلے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک، "اسلام چھوڑ دینے" سے مراد یہی نہیں کہ وہ مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے، اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقاید صحیح نہیں رہے اور اس طرح اس پر کفر کا فتوےٰ لگا دیں، تو اسے بھی مرتد سمجھا جائے گا اور وہ واجب القتل ہوگا۔ مودودی صاحب اس باب میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے (اپنے کتابچہ ۔۔۔ مرتد کی سزا ۔۔۔ میں) لکھ دیا کہ جب پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو موجودہ مسلمانوں کو نوٹس دے دیا جائے گا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر صحیح اسلامی عقاید اختیار کرلیں (یعنی وہ عقاید جنہیں مودودی صاحب "اسلامی" قرار دیدیں) ورنہ انہیں (سب کو) قتل کر دیا جائے گا۔

طلوعِ اسلام نے اس عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل) کے خلاف شروع سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ مسلک قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہے ۔۔۔ قرآن کے نزدیک، ایمان نام ہے حق و صداقت پر دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ یقین رکھنے کا۔ اس لئے اس میں مذہب کی پوری آزادی ہے۔ اگر کوئی مسلمان (بدقسمتی سے) اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کرلے گا تو وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہے گا۔ یہ چیز قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے کہ ایک غیر مسلم کو تو اجازت ہو کہ وہ جی چاہے تو غیر مسلم رہے اور جی چاہے تو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کرلے لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے یعنی جو مذہبی آزادی کافر کو حاصل ہے مسلمان پر اس کے دروازے بند ہو جائیں ۔۔۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے طلوعِ اسلام کے خلاف جو الزامات عاید کئے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ مرتد کو واجب القتل قرار نہیں دیتا۔

مغربی پاکستان کی ہائیکورٹ نے چٹان پریس سے متعلق رٹ درخواست کے فیصلہ (مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء) میں[1]

---

[1] WRIT PETITION NO: 937 - 1968

میں ضمناً اس سوال کو بھی لیا ہے (کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں) اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔ فیصلہ کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے (واضح رہے کہ ہم اس وقت احمدیوں کے عقاید اور ان کے کفر و اسلام کے متعلق بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف فیصلے کے اس حصہ کو سامنے لا رہے ہیں جس میں مرتد کی سزا کے سوال سے بحث کی گئی ہے):-

جہاں تک ان واقعات کا تعلق ہے جن میں احمدیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہبی استبداد کی تاسف انگیز مثالیں ہیں اور اگر انسانی معاملات میں کوئی خوبی اور شرافت (DECENCY) باقی ہے تو انسانی ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے۔ یہ واقعات، صحیح اسلامی تعلیم اور احکام کے کس قدر خلاف ہیں، اس کی وضاحت سورۃ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں موجود ہے جو نہایت واضح طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ــــ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[1] ــــ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ اسی طرح (اسی سورہ کی) آیت ۶۲ میں بھی تمام اہل مذاہب کو (مذہبی) آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ــــ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے اور جو یہودی کتب مقدسہ کا اتباع کرتے ہیں اور عیسائی اور صابئین ــــ اور جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ملے گا۔ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا ــــ سورۃ آل عمران کی آیت ۷۹ میں ایک ایسا متعین حکم ہے جس کی رو سے کسی انسان کو ــــ حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی ــــ اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر زبردستی ٹھونسے۔ (وہ آیت یہ ہے) ــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ــــ کسی انسان کے لئے جسے خدا نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی ہو، (یہ ممکن نہیں) کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا

---

[1] اصل فیصلہ میں صرف انگریزی ترجمہ (علامہ یوسف علی) دیا گیا ہے۔ آیات ہم نے خود درج کر دی ہیں۔ ترجمہ وہی دیا گیا ہے جو فیصلہ میں درج ہے۔

کے نہیں بلکہ میرے پرستار بن جاؤ۔ (اس کے برعکس وہ کہے گا کہ ہم اس خدا کے پرستار ہیں جو سب کا پروردگار ہے کیونکہ تم نے کتاب کی تعلیم دی ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا ہے۔

فکر و ضمیر کی آزادی کی ضمانت اس سے واضح تر الفاظ میں دی نہیں جا سکتی تھی۔

ہم قرآن کریم کی سند و حجت کی بنیاد پر فیصلہ دینے والے ان جج صاحبان کو مستحق تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں۔ کسقدر موجب اطمینان ہے یہ امر کہ مسلمان اب رفتہ رفتہ پھر سے قرآن کے قریب آ رہا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک!

۲۔ گناہ کی فلاسفی۔ (احمدی — لاہوری — حضرات سے ایک سوال)

احمدی (لاہوری) حضرات کے مسلک کے ترجمان "پیغام صلح" کی ۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے صفحہ اوّل پر "گناہ کی فلاسفی" کے عنوان سے حسب ذیل "ملفوظات حضرت مسیح علیہ السلام" (یعنی مرزا صاحب کے ارشادات) شائع ہوتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت صاحب کی خدمت میں عرض کی کہ دنیا میں لوگ بہت گنہگار ہوں گے مگر میرے جیسا گنہگار تو کوئی نہ ہوگا۔ میں نے بڑے بڑے سخت گناہ کئے ہیں۔ میری بخشش کس طرح ہوگی؟ حضرت نے فرمایا۔

دیکھو خدا تعالےٰ جیسا غفور اور رحیم کوئی نہیں۔ اللہ تعالےٰ پر یقین کامل رکھو کہ وہ تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے اور بخش دیتا ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے کہ اگر دنیا بھر میں کوئی گنہگار نہ رہے تو میں ایک اور امت پیدا کرونگا جو گناہ کرے اور میں اُسے بخش دوں گا۔ اللہ تعالےٰ کے ناموں میں سے ایک نام غفور ہے اور ایک رحیم۔ یاد رکھو گناہ ایک زہر ہے اور ہلاکت ہے مگر توبہ اور استغفار ایک تریاق ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ ان اللہ یحب التوابین ویحب المطہرین۔ اللہ تعالےٰ ان لوگوں سے پیار کرتا ہے جو توبہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پاک ہو جاویں۔ خدا تعالےٰ نے ہر ایک شے میں ایک حکمت رکھی ہے۔ اگر آدم گناہ کر کے توبہ نہ کرتا اور خدا تعالےٰ کی طرف نہ جھکتا تو صفی اللہ کا لقب کہاں سے پاتا؟ اگر کوئی انسان اپنے آپ کو دیکھتا کہ جیسا ماں کے پیٹ سے نکلا ہے اور اپنے اندر کوئی گناہ نہ دیکھتا تو اس کے دل میں تکبر پیدا ہوتا جو تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے اور شیطان کا گناہ ہے۔ شیطان نے گھمنڈ کیا کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اسی واسطے وہ شیطان بن گیا۔ گناہ جو انسان سے صادر ہوتا ہے وہ نفس کو توڑنے کے واسطے ہے جب انسان سے گناہ ہوتا ہے تو وہ اپنی بدی کا اقرار کرتا ہے اور اپنے عجز کو یقین کر کے خدا تعالےٰ کی طرف

جھکتا ہے جس طرح مکھی کے دو پر ہیں کہ ایک میں زہر ہے اور دوسرے میں تریاق ہے۔ حدیث شریف میں ہے اگر تمہارے کھانے پینے کی چیز میں مکھی پڑے تو اپنا صرف ایک پر اس کے اندر ڈبوتی ہے جس میں زہر ہے تم اس کو نکالنے سے پہلے اس کا دوسرا پر بھی ڈبو لو کہ وہ اس کے بالمقابل تریاق ہے۔ یہ مثال انسان کے گناہ اور توبہ کی ہے۔ اگر گناہ صادر ہو جاوے توبہ کرو کہ وہ اس کے واسطے تریاق ہے اور گناہ کے زہر کو دور کر دیتا ہے۔ عاجزی اور تضرع سے خدا تعالیٰ کے حضور میں جھکو تاکہ تم پر رحم کیا جاوے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو ترقی بھی نہ ہوتی۔ جو شخص جانتا ہے کہ میں نے گناہ کیا ہے اور اپنے آپ کو ملزم دیکھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا ہے تب اس پر رحم کیا جاتا ہے اور وہ ترقی پکڑتا ہے۔ لکھا ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہٗ ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ گویا اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں۔ لیکن توبہ سچے دل کے ساتھ ہونی چاہیئے کہ انسان پھر کبھی اس گناہ کا مرتکب نہ ہو گا۔ گو بعد میں بسبب کمزوری کے ہو جاوے لیکن توبہ کرنے کے وقت اپنی طرف سے یہ پختہ ارادہ اور سچی نیت رکھتا ہو کہ آئندہ یہ گناہ نہ کرے گا۔ نیت میں کسی قسم کا فساد نہ ہو۔ بلکہ پختہ ارادہ ہو کہ قبر میں داخل ہونے تک اس بدی کے قریب نہ آئے گا تب وہ توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو امتحان میں ڈالتا ہے تاکہ ان کو انعام دیوے انعام حاصل کرنے کے واسطے امتحانوں کا پاس کرنا ضروری ہے۔ (ملفوظات جلد نہم)

ہم اس وقت گناہ کی اس فلاسفی کے متعلق بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ان ملفوظات میں یہ تحریر ہے کہ

خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر دنیا بھر میں کوئی گنہگار نہ رہے تو میں ایک اور امت پیدا کروں گا جو گناہ کرے اور میں اسے بخشش دوں گا۔

ہم (لاہوری) جماعت احمدیہ سے بالعموم اور مدیر "پیغام صلح" سے بالخصوص، دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کہاں فرمایا ہے کہ "اگر دنیا بھر میں کوئی گنہگار نہ رہے تو میں ایک اور اُمت پیدا کروں گا جو گناہ کرے اور میں اسے بخشش دوں گا۔" آپ حضرات کے جواب کے لئے طلوع اسلام کے صفحات حاضر ہیں گے۔

(۱)

۲۔ ہماری تاریخ

روزنامہ "کوہستان" کے معراج النبیؐ نمبر (۱۹ر اکتوبر ۱۹۶۰ء) میں، مولانا احمد علیؒ کا ایک مضمون "معراج سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

اختلاف روایات معراج شریف کس سال میں ہوا	
سال	حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری شرح بخاری باب معراج
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	" " " " " "
ہجرت سے گیارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " " "
ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	فتح الباری وعینی شرح البخاری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری وعینی شرح البخاری
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے اٹھارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے تین سال پہلے ہوا	عینی شرح بخاری
ہجرت سے آٹھ سال پہلے ہوا	" " "

اختلاف روایات معراج شریف کس ماہ میں سال میں ہوا	
نام ماہ	حوالہ کتاب
شوال	فتح الباری وعینی شرح البخاری
ذی الحجہ	" " " " "
ربیع الاوّل	" " " " "
ربیع الآخر	فتح الباری
رجب	فتح الباری وعینی شرح البخاری
رمضان	فتح الباری
..	..
..	..
..	..

یہ اختلاف

(۱) اس واقعہ کے ضمن میں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے اسے بیان فرمایا تو کفار نے اس پر بڑے اعتراض کئے اور اس طرح اس کا چرچا عام ہو گیا۔ اور

(۲) اختلافات مختلف کتب روایات و سیر سے نہیں لئے گئے، احادیث کی معتبر ترین کتاب ـــ بخاری ـــ سے لئے گئے ہیں۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری (کتب تاریخ میں نہیں بلکہ) کتب احادیث تک میں، خود عہد رسالتمآبؐ کے اہم ترین واقعات کے متعلق بھی جو کچھ مذکور ہے اس میں کس قدر تضاد ہے۔

(۰)

۴۔ تفسیر قرآن میں اجتہاد کی گنجائش

ہفتہ وار المنبر (لائل پور) کی ۱۸ تا ۲۵ اکتوبر کی اشاعت کے صفحہ اول پر "امام غزالی کی نکتہ چینی" کے عنوان سے

حسب ذیل الفاظ شائع ہوتے ہیں۔

امام غزالیؒ نہ صرف یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے والوں کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو صحابہؓ اور تابعینؒ سے منقول تفسیر کو پسند کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔

غزالیؒ کے وجوہ تنقید مندرجہ ذیل امور ہیں:-

(۱) اگر یہ درست ہے کہ آنحضرتؐ نے قرآن کریم کی ساری تفسیر بیان فرما دی ہے تو ضروری ہے کہ سلف سے جو کچھ بھی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے وہ سند صحیح کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو اور سب کا سب آپؐ سے سنا ہو۔ لیکن یہ بات قرآن کے صرف بعض حصوں کے بارے میں تو درست ہے، سارے قرآن کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا اور جب صورت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ساری قرآن کی تفسیر کا صرف کچھ حصہ ہی ہم تک پہنچا تو ہمیں چاہیئے کہ باقی حصہ کے بارے میں آنحضرتؐ سے منقول تفسیر کی روشنی میں، تفسیر سمجھنے کی کوشش کریں۔

(۲) یہ کہ صحابہؓ سے منقول جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں، لامحالہ اسے تفسیر بالرائے قرار دیا جائے گا اور جب انہوں نے ایک طرح ڈال دی ہے تو مناسب ہے کہ ہم بھی ان کے راستہ پر چلیں اور تفسیر میں ان کے افکار و آراء سے اسی طرح مستفید ہوں جس طرح فقہ میں ان سے استفادہ کرتے اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی اس امر میں مانع نہیں ہے کہ ہم قرآن کو اپنے اجتہاد سے سمجھنے کی کوشش کریں بشرطیکہ صحیح علمی بنیادوں پر قرآن فہمی کی قابلیت کسی شخص میں پیدا ہو چکی ہو۔

اس کے باوجود ان حضرات کی عملی کیفیت یہ ہے کہ اگر آج کوئی شخص اپنے اجتہاد سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے تو یہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سلف صالحین کی تفسیر کے خلاف ہے۔

(۰)

۵۔ آہ! ہمارے بچے!!

ہفتہ وار اخبار المنبر کی ۱۸-۲۵ اکتوبر کی اشاعت میں حسب ذیل ہوش ربا اور جگر سوز خبر شائع ہوئی ہے:-

"پچھلے دنوں لندن میں ایک انگریز مصنف سٹیفن بارلے نے اپنی دستاویزی رپورٹ "جنسی غلامی" میں یہ حیرت انگیز اور افسوسناک انکشاف کیا ہے کہ ــــ

پاکستان میں جو کمسن بچے اغوا ہوتے ہیں، ان کی بڑی تعداد مشرق وسطیٰ میں غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دی جاتی ہے۔ قیام پاکستان سے ۱۹۷۳ء تک پاکستان سے پچپن ہزار بچے اغوا کر کے دوسرے ملکوں میں

فروخت کئے جا چکے ہیں۔ ان میں دو تہائی چھ سے بارہ سال کی عمر کی لڑکیاں ہیں۔

مسٹر بارلے نے اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ میں نے بردہ فروشی کے مسئلے کا جائزہ لینے کے لئے پانچوں براعظموں کا دورہ کیا ہے اور اپنی رپورٹ متعلقہ ملکوں کے سرکاری ذرائع سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار پر مرتب کی ہے۔ مسٹر سٹیفن بارلے اس سلسلے میں پاکستان بھی آئے اور اقوام متحدہ کے ذرائع سے بھی اپنی معلومات کی تصدیق کی۔

آپ نے اپنی رپورٹ کے صفحہ ۷۷ پر لکھا ہے۔

"مشرقِ وسطےٰ میں پاکستانی بچوں کی بہت مانگ ہے۔ چنانچہ مشرقی اور مغربی پاکستان سے ہر ہفتے بارہ بچے اغوا کئے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ صرف ۱۹۶۲ء میں تین ہزار بچے اغوا کرکے فروخت کئے گئے۔ ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی پچھتر پونڈ (ایک ہزار روپے) میں فروخت ہوتی ہے۔ لڑکے کی قیمت ۱۵۰ پونڈ سے ۳۰۰ پونڈ تک ہے۔ لڑکیوں کو قحبہ خانوں میں فحاشی پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ان پر جبر و تشدد بھی کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں پاکستان پروگریسو موومنٹ مانچسٹر کے صدر مسٹر احسان الحق علوی نے مسٹر سٹیفن بارلے کی رپورٹ کے اقتباسات ایک پاکستانی اخبار کو بھیجتے ہوئے صدر ایوب سے درد مندانہ اپیل کی ہے کہ وہ اس مسئلہ پر ذاتی طور پر توجہ دے کر ملک کو بردہ فروشی سے نجات دلائیں۔

چونکہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ خبر کہاں تک صحیح ہے، اس لئے ہم سردست حکومت سے گزارش کریں گے کہ وہ پبلک کو مطلع کرے کہ صحیح پوزیشن کیا ہے؟ ملک میں بچوں کے اغوا کے واقعات تو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن اسوقت تک عام تاثر یہی تھا کہ ان بچوں کو اغوا کرنے والے ان کی صورتوں کو مسخ کر کے، ملک میں بھکاری بنا دیتے ہیں۔ جن والدین کے بچے اس طرح گم ہو جاتے ہیں ان کے لئے اگرچہ یکساں ہے کہ وہ ملک کے اندر رکھے جاتے ہیں یا باہر بھیج دیئے جاتے ہیں ——— ان ستم رسیدگان کو تو بہرحال باقی زندگی خون کے آنسو بہانے میں گذارنی ہوتی ہے۔ لیکن اگر بردہ فروشی نے اس قسم کی منظم صورت اختیار کر رکھی ہے تو یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل اور حکومت کی خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ ہم حکومت کی طرف سے وضاحت کا بڑی بیتابی سے انتظار کریں گے۔

(٠)

۷۔ ایک خوش نتیجہ فیصلہ

قرآن کریم میں ہے کہ عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (۲/۲۱۶)۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک

چیز کو تم بہت پسند کرتے ہو لیکن درحقیقت وہ تمہارے لئے نقصان کا موجب ہوتی ہے۔" اگرچہ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے ہاں مل سکتی ہیں لیکن ان میں سب سے بین مثال ہمارے سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے نصاب کا داخل کیا جانا تھا۔ نام کے اعتبار سے دیکھئے تو کون سا مسلمان ہوگا جو بچوں کو اسلامی تعلیم دینے کے خلاف ہوگا لیکن جو کچھ ان بچوں کو اسلامیات کے نام پر پڑھایا جاتا ہے اس کے نتائج پر نگاہ ڈالئے تو شاید ہی کوئی دیدۂ بینا ہو جو اس پر اشکبار نہ ہو۔ اس دشواری کا سامنا بالخصوص ان گھروں کو کرنا پڑتا ہے جہاں بچوں کو یہ بتایا اور سمجھایا جاتا ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جسے علم و بصیرت کی رو سے سمجھا اور عقل و فکر کی روشنی میں مانا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ بچے اپنی دینیات کی کتاب کو کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں تو اس میں اُسی اسلام کے متعلق اس قسم کی باتیں لکھی ملتی ہیں جو علم و بصیرت کے خلاف اور عقل و فکر کی نقیض ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اسے ایک واقعہ سے سمجھئے جسے محض تمثیلاً بیان کیا جاتا ہے۔ ایک بچے کو یہ بتایا گیا کہ اس کی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں، تو وہ شام کو روتے روتے گھر آگیا اور کہنے لگا کہ جب اس نے ماسٹر صاحب سے یہی کہا تو انہوں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ اور جب اس نے امتحان میں یہی کچھ لکھ دیا تو اسے اسلامیات میں فیل کر دیا گیا۔ اور چونکہ اسلامیات 'لازمی مضمون' تھا اس لئے (وہ نہایت قابل اور ہوشیار ہونے کے باوجود) سارے امتحان ہی میں فیل قرار دے دیا گیا۔ اگلے سال اس سے چھوٹا یہ کہا گیا کہ بیٹا! بات تو وہی ٹھیک ہے جو تمہیں گھر میں بتائی جاتی ہے لیکن امتحان پاس کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم پرچے میں وہی کچھ لکھو جو کتاب میں دیا گیا ہے۔ اس پر اس نے باپ سے کہا کہ ابا جان! آپ مجھے ابھی سے یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ میں کسی مقصد میں کامیابی کے لئے وہ کچھ کہوں جسے میرا دل صحیح نہیں مانتا ——— باپ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

اور یہ واقعہ کسی ایک "باپ اور بیٹے" کا نہیں۔ یہ کشمکش ہر اس گھر میں جاری ہے جہاں اسلام کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ قوم اس کے ہاتھوں تنگ آچکی ہے اور اس کا کوئی حل کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ معلوم کر کے بڑا اطمینان ہوا کہ حکومت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسلامیات کا مضمون لازمی نہیں رہے گا۔ اختیاری ہوگا۔ جس کا جی چاہے اسے لے لے جس کا جی چاہے نہ لے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۶۹ء)

الحمدللہ کہ اس کشمکش سے جان چھوٹی۔ اب بچوں کو گھروں میں صحیح اسلام کی تعلیم ملے گی اور انہیں امتحان پاس کرنے کے لئے ایسی باتیں نہیں لکھنی پڑیں گی جن کی گواہی ان کا دل نہ دیتا ہو۔

ہمارے موجودہ تعلیمی نظام نے ہماری نئی نسلوں کو بُری طرح سے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ بیچارے "نہ دین کے رہتے ہیں نہ دنیا کے"۔ قوم اپنی مفاد پرستیوں میں مدہوش ہے اور کسی کو نہ اس کی فکر ہے کہ اس نئی نسل کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور نہ اس کا کوئی خیال کہ اس سے جو (PROBLEMS) پیدا ہو رہی ہیں وہ ملک کے مستقبل کے لئے کس قدر خطرناک ہیں۔

~~~~~~ (٭٭) ~~~~~~
~~~~~~

باسمہٖ تعالیٰ

مذہب زندہ دلاں خواب پریشانے نیست
از ہمیں خاک
جہانے دگرے
ساختن است

پرویز صاحب کا خطاب

جس سے انہوں نے شرکائے طلوع اسلام کنونشن منعقدہ

۱۰ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۸ء کا

استقبال کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہانے دگرے

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

ہم نوایانِ زمزمۂ قرآنی و ہمرہانِ جادۂ فرقانی۔ سلام و رحمت!

عید ہمیشہ ایک سال کے بعد آتی ہے لیکن ہماری اس عید کو دیکھئے کہ سال کے بجائے گیارہ ماہ کے بعد ہی وجہ تابانیٔ قلب و جگر اور باعث شادابیٔ فکر و نظر ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر دل میں جذب صادق اور سر میں سودائے محمل ہو تو راستے سمٹ جاتے ہیں اور منزلیں خود آگے بڑھ کر قدم چوم لیتی ہیں۔ آپ احباب جو اتنی دور سے مسافتیں طے اور صعوبات سفر برداشت کر کے، بلا کسی ذاتی مفاد اور بغیر کسی جذبۂ نمود و ستائش، فقط شمع قرآنی کو فروزاں تر کرنے کے لئے، قافلہ در قافلہ اس مرکز کی طرف رواں دواں چلے آتے ہیں تو اس سے بڑھ کر آپ کے جذبۂ صادقہ اور خلوص بے پایاں کی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس گیارہ ماہ کے عرصہ میں کہ آپ احباب میرے قریب نہیں تھے میرا مشغلہ اس کے سوا کیا تھا کہ

خلوت میں رہی ہیں تیری باتیں
جلوت میں کہے تیرے فسانے

کیسی حسین ہوتی ہیں میری یہ خلوتیں اور کیسی کیف بار ہوتی ہیں یہ جلوتیں۔ خدا میرے اس کیف و سرور کو ابدکنار کرے اور ان شمعوں سے میری زندگی کے راستوں کو روشن رکھے۔

رفیقانِ گرامی قدر! آپ احباب کو علم ہوگا کہ میں تحریک پاکستان کی جنگ میں پوری قوت و توانائی کے ساتھ شریک تھا۔ اس دور کے طلوع اسلام کے فائل اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ہم نے وہ چومکھی لڑائی کس جذب و انہماک اور کس عزم و استقلال سے لڑی تھی۔ اس دور میں قوم کی کیفیت کیا تھی۔ اسے سمجھنے کے

لئے آپ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے سترہ روز سامنے لائیے۔ ان سترہ دنوں میں، قوم میں جو یک جہتی و ہم آہنگی، یگانگت و مواخات، بے لوث خدمت اور بے مزد و معاوضہ ایثار، قانون کا احترام اور ضوابط کی پابندی، باہمی خوش معاملگی اور حسنِ سلوک کے مظاہرے ہوئے۔ یعنی ان سترہ دنوں میں جس طرح انسانیت ابھر کر اوپر آگئی اور حیوانیت منہ چھپا کر غاروں میں سمٹ گئی، قریب قریب وہی کیفیت تحریکِ پاکستان کی دس سالہ زندگی میں تھی۔ بجز اُن غدارانِ ملت کے جنہوں نے اس مطالبہ کی مخالفت کی، پوری کی پوری قوم کے سامنے ایک منزل تھی اور ہر ایک کا قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا تھا۔

لیکن ستمبر ۱۹۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ کے بعد جو کچھ اس ملک میں ہوا، اسے غالب کے اس مرثیہ سے بہتر اور کونسے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں　　نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ان سترہ دنوں کے بعد یوں نظر آیا جیسے قوم نے انسانیت سے پورا پورا انتقام لیا ہو کہ وہ ابھر کر سطحِ زندگی پر کیوں آگئی تھی۔ قوم اُس زمانے میں جتنی بلندی پر پہنچ گئی تھی، اس کے بعد اس سے کہیں زیادہ پستی میں گر گئی۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے قوم سخت پشیمان تھی کہ اُس سے اُن دنوں جوہرِ شرافت و نجابت کی نمود کیوں ہو گئی تھی، اور اب وہ اپنے اُس جرم کا کفارہ دے رہی ہے۔ جن حالات سے ہم اب گذر رہے ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ کسی قوم کی حیاتِ اجتماعیہ میں اس سے بدتر دور کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ بجز اس کے کہ یہی قوم اس کے بعد اس سے بدتر دور کی بھی کوئی مثال پیش کر دے۔

جو کچھ ہمارے ساتھ ان سترہ دنوں کے بعد ہوا کم و بیش وہی کچھ ہم نے تحریکِ پاکستان کی دس سالہ جنگ کے بعد کر کے دکھا دیا۔ جب پاکستان حاصل ہو گیا، جس طرح رزمگاہِ پاکستان کے وہ دس سال ہمارے لئے حاصلِ زندگی تھے، اسی طرح اس کے بعد کے یہ بیس سال ننگِ انسانیت ہیں ـــــ یوں نظر آتا ہے جیسے مقصد میں کامیابی ہماری قوم کو راس ہی نہیں آتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں (بہ تغیرِ مفہوم) کہ

مقامِ ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؔ　　مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

اس میں شبہ نہیں کہ حصولِ پاکستان کے بعد ہم نے نمایاں طور پر مادی ترقی کی ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس دوران میں ہم شرفِ انسانیت سے جس قدر عاری ہو گئے ہیں اور ہوتے چلے جا رہے ہیں اس کی مثال بھی بمشکل مل سکے گی۔ مجھے اس کے لئے نظائر و شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم میں سے کون ہے جسے اس انسانیت سوز معاشرہ کی تلخ کامیوں کا تجربہ نہیں۔

لیکن عزیزانِ من! جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، وہ ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں، اس وقت ساری دنیا میں حالت یہ ہو چکی ہے کہ شیطنت ابھرتی چلی آ رہی، اور انسانیت سمٹتی چلی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے جو معاشرتی عیوب اور اخلاقی ذمائم، قانون شکن اور جرائم پیشہ عناصر تک محدود ہوتے تھے، وہ اب سوسائٹی کا عام چلن بنتے جا رہے ہیں، اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، اس جہنم نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اگرچہ تفصیل میں جانے سے، اس کے متعدد اسباب و علل سامنے آ جائیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بنیادی وجہ، مغرب کا جمہوری نظام ہے جسے کامل یا ناقص طور پر، قریب قریب تمام اقوامِ عالم نے اپنا لیا ہے یا اپنا رہی ہیں۔ نظر بہ ظاہر یہ چیز بڑی عجیب سی دکھائی دے گی کہ جس نظام کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا معراج سمجھا جاتا ہے، اور جسے دنیا تمام انسانی مشکلات کا حل قرار دے رہی ہے، اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ دنیا جس جہنم میں اس وقت مبتلا ہے اس کی بنیادی وجہ وہی نظام ہے۔ لیکن ہے یہ حقیقت۔ جمہوری نظام کا ماحصل یہ ہے کہ ملک میں وہی کچھ ہو جسے ملک کی اکثریت پسند کرے۔ جس فرد یا پارٹی کو جمہوری طریق سے کامیاب ہونا ہو، اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرے۔ اور زیادہ سے زیادہ ووٹ اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب آپ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو راضی رکھ سکیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ملک کی اکثریت لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو جائے، جب قانون شکنی کا چلن عام ہو جائے، جب سلبِ نہب معاشرہ کا وطیرہ بن جائے، جب ہوسِ زر پرستی ہر اس شخص کو پاگل بنا رہی ہو جس کا معاشرہ میں کچھ اثر ہے۔ جب (پنجابی محاورہ کے مطابق) "چور اچکا چوہدری۔ اور غنڈی رن پردھان" بن جائے۔ تو اس وقت جو فرد یا جماعت اس روش کی روک تھام کے لئے کوئی اصلاحی قدم اٹھائے، یا بدکرداروں کو ان کی بدکرداری سے روکے یا سرزنش کرے، اسے ووٹ نہیں مل سکیں گے۔ اس لئے وہ کسی قسم کے اصلاحی اقدام کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مغرب کے جمہوری نظام میں، معاشرہ میں کسی قسم کی ریفارم ہو نہیں سکتی۔ اور جب معاشرہ میں ریفارم نہ ہو سکتی ہو تو پھر برائیوں کے عام ہونے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جس تیزی سے جرائم بڑھ رہے ہیں، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ کچھ اس وقت ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ لیکن جن ملکوں میں مذہب پرستی کا جذبہ جتنا زیادہ ہے، وہاں یہ

جمہوری نظام' اور بھی زیادہ تباہ کن نتائج کا موجب بن رہا ہے۔

مذہب پرستی (دین کی پابندی نہیں بلکہ مذہب پرستی) ہمیشہ جہالت میں پنپتی اور توہم پرستیوں میں پروان چڑھتی ہے۔ جس ملک میں مذہبیت زیادہ ہوگی اس میں مذہبی پیشوائیت کا زور ہوگا' اس لئے کہ مذہب کے معاملہ میں عوام ہوتے ہی مذہبی پیشواؤں کے امتی ہیں۔ مذہبی پیشوائیت کی مفاد پرستی کا راز اس میں ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس میں سرمو فرق نہ آنے پائے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص کسی ایسی بات میں جو پہلے سے ہوتی چلی آرہی ہے' ذرا سی بھی تبدیلی سوچے گا' تو مذہبی پیشوائیت لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ اور جب مذہبی پیشوائیت اسکی مخالفت کرے گی تو عوام خود بخود اس کے مخالف ہو جائیں گے۔ لہٰذا جو فرد یا جماعت' جمہوری طریق سے کامیاب ہونا چاہے وہ ان بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کرے گی۔ یوں ایسے ممالک میں جہاں مذہبیت زیادہ گہری ہو' ڈیماکریسی کے پردے میں تھیاکریسی حکومت کرتی ہے۔ اور جسے آزادی سمجھا جاتا ہے وہ غلامی کی بدترین شکل ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے' جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے ان الفاظ میں بے نقاب کیا تھا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

معاشرہ میں اصلاح صرف قرآن کے مشاورتی نظام سے ہو سکتی ہے۔ اس نظام سے مفہوم یہ ہے کہ وحیٔ خداوندی کی طرف سے عطا شدہ کچھ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول ہیں جن کے تابع معاشرہ کی ہیئت اجتماعیہ کو برحال رہنا ہے۔ ان اصول و اقدار میں کسی قسم کے تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کا اختیار' اکیاون فی صد تو ایک طرف' ملک کی سو فیصد آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس قوم کے لئے کرنے کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ ان اقدار و اصولات کو' اپنے زمانے کے حالات کے مطابق' ملک میں نافذ کس طرح کیا جائے۔ اس فریضہ کو یہ قوم باہمی مشاورت سے سرانجام دیتی ہے۔ اس نظام کی علمبردار جماعت کو یہ نہیں دیکھنا ہوتا کہ ملک کی اکثریت کیا چاہتی ہے۔ اسے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وحی کی راہ نمائی کا تقاضا کیا ہے۔ یہ نظام قوم کی خواہشات و آراء کے پیچھے نہیں چلتا۔ قوم کو وحیٔ خداوندی کے پیچھے چلاتا ہے۔ اس نظام کا داعی اس آواز کو اس وقت بھی بلند کرتا ہے جب دنیا میں کوئی ایک فرد بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا' اور اسے بلند کئے چلا جاتا ہے خواہ اکثریت اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے۔ اس نظام کی کامیابی ووٹوں کی گنتی پر نہیں ہوتی۔ ان غیر متبدل اصول و اقدار کی کارفرمائی پر ہوتی ہے۔ اور چونکہ آج دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کی کارفرمائی کہیں نہیں اس لئے ہر جگہ شیطنت کھلے بندوں ناچ رہی ہے ـــــ کہیں خدا فراموشی کی عریانی کے ساتھ اور کہیں خدا پرستی کے پُرفریب لبادوں میں لپٹی ہوئی۔

میں نے عزیزانِ من! شمعِ قرآنی کی روشنی میں آج سے تیس سال قبل یہ آواز بلند کی کہ انسانیت کی نجات وفلاح کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ ہے وحی کی عطا کردہ اقدار کی کارفرمائی۔ تحریکِ پاکستان سے میری وابستگی اور مسئلہ تشکیلِ پاکستان سے میری شیفتگی اسی جذبہ کی رہینِ منت تھی۔ اور حصولِ پاکستان کے بعد میری تمام تگ و تاز کا مرکز اور سعی و عمل کا محور بھی یہی قبلہ مقصود ہے۔ تیس سال سے میرے سامنے ایک ہی منزل ہے اور میرا ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے۔

پکارتا ہوا ہر رہگذر پہ نام تیرا
پہنچ گیا ہوں کہاں سے کہاں خدا جانے

میرے اس سفرِ زندگی میں آپ احباب کی رفاقت میرے لئے بڑا تقویت بخش سہارا رہی ہے اور ہے۔ میں اپنی اس طلب و جستجو میں جن جن وادیوں میں گھوما آپ نے مجھے کہیں تنہائی محسوس نہیں ہونے دی۔ سفرِ حیات کی جادہ پیمائی میں اس قسم کے افرادِ کارواں کا مل جانا انسان کی بڑی خوش بختی اور فیروزمندی ہے۔ کبھی وہ زمانہ تھا جب میں بصد حسرت کہا کرتا تھا کہ

عمر بھر کی نواگری کا صلہ
یا خدا کوئی ہمنوا ہی دے!

اور آج میں دل کے کامل سکون اور بدرگاہِ رب العزت سجدۂ شکرانہ کے ساتھ بڑی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اللہ ان رازدانوں کے سینے میں مزید وسعت اور قلب میں اور کشادگی عطا فرمائے تاکہ یہ اس متاعِ قرآنی کو زیادہ سے زیادہ سمیٹ کر اپنے گنجینوں میں محفوظ کر سکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ میں نے ان تیس سال کے عرصۂ دراز میں قرآنی فکر کے متعلق جو کچھ کہا اور حقیقتاً جو کچھ لکھا وہ کافی سے بھی زیادہ دکھائی دیتا ہے لیکن قرآنِ کریم کا عزیزانِ من! کچھ انداز ہی نرالا ہے۔ یوں تو یہ کتاب اس قدر مختصر ہے کہ میرے کمرے کے اندر آویزاں ایک چارٹ پر پوری کی پوری کتاب مرقوم ہے لیکن معانی کے اعتبار سے یہ اس قدر عظیم ناپیدا کنار ہے کہ گزشتہ تیس پینتیس سال سے میں الحمد سے والناس تک اس کی تلاوت التزاماً کرتا چلا آ رہا ہوں۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ جب میں ایک بار والناس تک پہنچتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ میں نے قرآنِ کریم ختم کر لیا ہے لیکن جب دوسری صبح الحمد سے شروع کرتا ہوں تو ایسا نظر آتا ہے جیسے میں نے ابھی

اس کی ابتدا کی ہے۔ اسی طرح میں اپنی ہر تصنیف کے بعد خیال کرتا ہوں کہ میں نے کرنے کا کام کر دیا ہے لیکن اس کے بعد نظر آتا ہے کہ

کہہ گئے ان سے لاکھ افسانے
پھر بھی کہنے کی بات باقی ہے

قرآنِ کریم، برادرانِ محترم! انسان کا جنم جنم کا ساتھی ہے۔ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲/۱۳۲) کا یہی مفہوم ہے۔

جہاں تک عزیزانِ من! ہماری تحریک کا تعلق ہے، آپ جانتے ہیں کہ یہ چومکھی لڑائی ہے۔ چومکھی بھی کیوں؟ اس جنگ کے محاذوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کبھی تنہائی میں سوچئے کہ وہ کونسا گوشہ ہے جہاں سے قرآنی آواز کی مخالفت نہیں ہوتی۔ یہ آواز تو حضور نبی اکرمؐ کے ارشادِ گرامی کے مطابق "عرب و عجم کے خلاف اعلانِ جنگ ہے" بات ہے بھی واضح۔ قرآن لا اِلٰہ کا نقیب ہے۔ یعنی اللہ کے سوا ہر الٰہ کا مخالف۔ اور الٰہوں کا دنیا میں شمار ہی نہیں۔ جو لوگ قرآنی الٰہ کے یکسر مخالف ہیں انہیں تو چھوڑیئے۔ جو بظاہر نظر آتا ہے کہ آپ کی تائید کرتے ہیں، ان کی بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ اس وقت تک آپ کا ساتھ دیتے ہیں جب تک دوسروں کے الٰہ پر زد پڑتی رہے۔ جب ان کے اپنے الٰہ کی باری آتی ہے تو وہ اس کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے آپ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن قابلِ تاسف بات یہ ہے کہ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اسکا اعتراف و اعلان کریں کہ ہم نے ان کا ساتھ اس لئے چھوڑا ہے کہ ہمارے الٰہ پر زد پڑتی تھی۔ اس اعتراف سے انہیں شکستِ پندار ہوتی ہے اور شکستِ پندار کی برداشت بڑا عزم چاہتی ہے۔ اس لئے وہ اپنی علیحدگی کے لئے مختلف وجوہات تراشتے اور الزامات وضع کرتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب اس قسم کے "معترضین" میں بڑی حد تک کمی واقع ہو گئی ہے۔ اب ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جہاں آپ کسی کو اچھی طرح پرکھے پہچانے بغیر اپنی بزم کا رکن بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو میں آپ سے تاکید کیا کرتا ہوں کہ آپ اجنبی لوگوں کو پہلے متفقین کے حلقہ میں شامل کیا کریں اور جب کافی عرصے کے تجربہ کے بعد یہ حقیقت متیقن ہو جائے کہ وہ آپ کی تحریک اور قرآنی فکر کو اچھی طرح سمجھ چکا ہے تو پھر اُسے بزم میں شامل کیا کریں۔

———(٠)———

جہاں تک اس مصافِ زندگی میں ہماری کامیابی کا تعلق ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہم ابھی تک اپنے پروگرام میں آخری حد تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمارا منتہیٰ و مقصود اس خطۂ ارض میں قرآنی نظام کا قیام ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد ایک دو دن میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر یہ مقصد ایک دو نسلوں کے بعد بھی

حاصل ہو جائے تو اس عالمگیر طاغوتی دور میں اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ لیکن آپ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ آپ نے ہر غلط آواز کی مخالفت کی، اور ہر غیر قرآنی اقدام کے راستے میں سدِ گراں بن کر کھڑے ہو گئے۔ اور یہ کامیابی کچھ کم کامیابی نہیں۔

مانا کہ ہم نہ پھیر سکے آندھیوں کا رُخ
یہ تو ہوا کہ ان کے مقابل ٹھہر گئے!

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جو شخص قرآن کے خلاف لب کشائی کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی بات زبان تک لانے سے پہلے دس مرتبہ سوچتا ہے اور اکثر اُسے لوٹا کر اپنے سینے میں لے جانا پڑتا ہے کہ وہ وہاں آتشِ خاموش کی طرح سلگتی اور اس کی زندگی کو جہنم بناتی رہے۔

لیکن میری اپنی کیفیت، رفیقانِ محترم! یہ ہے کہ مجھے جس مقام پر کوئی ناکامی ہوتی ہے تو میں اس کے اسباب و علل کی تلاش میں خارجی دنیا کی طرف جانے سے پہلے، خود اپنے اندر جھانکتا ہوں کہ وہاں کیا کمزوری تھی جس کی وجہ سے وہ ناکامی ہوئی۔ یہی انداز عزیزانِ من! ہم سب کا ہونا چاہیئے۔ اور ہمیں ہر ناکامی کے وقت یہ کہنا چاہیئے کہ

نہیں اعتبارِ الفت جو نہ ہو سکا ابھی تک
میں سمجھ گیا یقیناً ابھی مجھ میں کچھ کمی ہے

اگر ہمارے اندازِ نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تو آپ دیکھیں گے کہ ہماری ناکامیاں کس قدر کم ہو جاتی ہیں۔ اور اگر کبھی ناکامی ہو بھی تو اس سے افسردگی اور پریشانی ہونے کے بجائے احتسابِ خویش کی ضرورت اور اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

آپ، عزیزانِ من! ان تحریکات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ماضی قریب میں ہمارے ہاں اُبھریں۔ ان میں بعض تو اُبھرنے کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور بعض آگے چلیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ ان میں کوئی تحریک بھی ایسی ہے جس نے قوم میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے اور اس کے تصورات و نظریات کو قرآن کے قالب میں ڈھالنے کو اپنا مطمحِ نگاہ قرار دیا ہو، اور پھر نہایت سکون و ثبات سے، این و آں سے غیر متأثر اپنے نصب العین کی طرف خاموشی سے بڑھے چلی جا رہی ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کو اپنی قرآنی تحریک کے سوا کوئی اور تحریک اس معیار پر پوری اترتے نہیں ملے گی۔ اس تقابل سے میرا مقصد دوسری تحریکوں کی تنقیص و تحقیر نہیں۔ میرا مطلب صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارے ہاں تحریکوں کا مقصد یا تو کسی ہنگامی مقصد کا حصول ہوتا ہے،

اور یا معاشرہ میں محض خلفشار و انتشار پیدا کرنا۔ یہ صرف آپ کی قرآنی تحریک ہے جس نے پہلے دن سے اپنے سامنے ایک واضح نصب العین رکھا اور اس کے بعد اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھتا چلا گیا۔ اس نے نہ کبھی کوئی ہنگامہ برپا کیا، نہ خلفشار مچایا۔ یہ نہایت خاموشی سے اپنے پیغام کو عام کرتی چلی گئی اور ہم آج، فخر و تکبر سے نہیں بلکہ بطور تحدیثِ نعمت، پورے اعتماد کے ساتھ اس حقیقت کے اعلان کرنے کے قابل ہیں کہ جس قدر کامیابی اس تحریک کو حاصل ہوئی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی ـــ اور میں تو جب اپنی ہزار سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس میں بھی کوئی دور ایسا نظر نہیں آتا جس میں اس قدر التزام اور تسلسل، اس قدر ثبات و سکون، اور اس قدر یک رنگی و یک جہتی کے ساتھ، قرآن اور خالص قرآن کی آواز بلند ہوئی ہو ـــ یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور پھر آپ کو یہ کامیابی نصیب ہوئی ہے وسائل و ذرائع کی اس قدر کمی اور ساز و براق کے اس درجہ فقدان کے باوجود۔ میں پھر دہرا دوں کہ آپ کی تحریک کے متبادل کوئی اور تحریک نہیں ـــ پاکستان میں ہی نہیں بلکہ کسی اور ملک میں بھی نہیں ـــ اور اس کی زندہ شہادت یہ حقیقت ہے کہ جس شخص نے بھی اس تحریک کے ساتھ کچھ دن گزارے اور اس کے بعد وہ کسی وجہ سے اس کا ساتھ چھوڑ گیا، اسے کسی اور تحریک میں قلبی سکون نہیں مل سکا۔ وہ کہیں اور کا رہا ہی نہیں۔ کس قدر سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

تیرے قدموں نے رونق دے کے جس سے چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو اس گھر کی ویرانی نہیں جاتی!

اور یہی وجہ ہے کہ جس نے ایک مرتبہ دل کے پورے خلوص کے ساتھ، قرآن کے آستانۂ عالیہ پر اپنا سر جھکا دیا، اس کے بعد وہ کسی بڑی سے بڑی چوکھٹ پر بھی سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ وہ سرمژگاں چمکنے والے ستارہ صبحگاہی کی نور پاشی میں، اپنی بے صوت صدا سے پکار اٹھتا ہے کہ

تیرے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو!
میں تیرے در سے جو اٹھوں تو کس کے در جاؤں

(۰)

میرے عزیز ہمسفرو! آپ اس حقیقت کو برسوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں کہ دین سے مقصود و مفہوم کیا ہے اور آپ کی تحریک کا مدعا و منتہیٰ کیا۔ لیکن میں آج کی نشست میں اس تمام تفصیل کو چند لفظوں میں سمٹا دینا چاہتا ہوں تاکہ یہ چیز "ایک" فارمولا" کی طرح (جسے ہماری بچپن کی زبان میں گر کہا کرتے تھے) ہر وقت آپ کے سامنے رہے۔ اسے غور سے سنیئے اور حرزِ جان بنا لیجئے۔

(۱) خدا کی تمام مخلوق میں، اختیار و ارادہ صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس کا یہی امتیاز اس کے شرف کا موجب ہے۔

(۲) جہاں جس انسان کا اختیار و ارادہ سلب ہوا، وہ مقامِ آدمیت سے گر گیا۔ اختیار و ارادہ کے سلب ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے فیصلے اور منشاء کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہو جائے۔

(۳) دین نام ہے اُس نظام کا جس میں کوئی فرد، اپنے آپ کو کسی اور کے فیصلے ماننے پر مجبور نہ پائے۔ واضح رہے کہ خود اس نظام کے فیصلوں کی پابندی کسی فرد کے اختیار و ارادہ کو سلب نہیں کرتی۔ اس لیے کہ جب وہ فرد اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے آپ کو اس نظام کے تابع لاتا ہے، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس نظام کے فیصلوں کو بطیبِ خاطر قبول کرتا ہے۔ اگر وہ کسی وقت اپنے آپ کو اس پر رضامند نہ پائے تو اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ اس دین کو چھوڑ دے — لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔ کے یہی معنی ہیں۔

(۴) دین کے اس نظام میں حاکم و محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں تمام افرادِ معاشرہ دل کی کامل رضامندی سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں، اس لئے انسان کا جو ارادہ محکومیت میں سلب ہوتا ہے، دین کے نظام میں وہ مجروح و مصلوب نہیں ہوتا۔

(۵) دوسری قربان گاہ جس پر انسان کا اختیار و ارادہ ذبح ہوتا ہے، ضروریاتِ زندگی کی احتیاج ہے۔ دین کے نظام میں کوئی فرد اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اس لئے اس مقام پر بھی شرفِ انسانیت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ میں عزیزانِ من! جب اس گوشے سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم پر غور کرتا ہوں تو میری نگہِ بصیرت وجد میں آجاتی ہے اور میں بے ساختہ پکار اٹھتا ہوں کہ

ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

حاجتمندوں کی امداد تو اور معاشروں میں بھی ہوتی ہے لیکن دیکھئے کہ وہاں شرفِ انسانیت کس طرح مجروح ہی نہیں ذبح ہوتا ہے۔ اس امداد کی شکل اور طریق کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کی روح خیرات (CHARITY) کی ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خیرات دینے والا لینے والے سے اپنے آپ کو ہر حال اونچے مقام پر سمجھتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جونہی کسی دینے والے نے اپنے آپ کو لینے والے سے اونچا سمجھا، وہ خود مقامِ آدمیت سے گر گیا۔ یہی وہ لغزش کی غیر محسوس لیکن بڑی خطرناک گھاٹی ہے جس سے محفوظ گزرنے کے لئے، قرآنِ کریم، دینے والوں کے اندر یہ نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ ان کے دل میں، اس کا معاوضہ تو ایک طرف، شکریہ تک کی بھی

تمنا بیدار نہ ہو۔ (لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا۔ ۹/۷۶)۔ لیکن قرآن عزیزان من! اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دینے والے کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا نہ ہو، لیکن لینے والا تو اپنے آپ کو زیر بار احسان سمجھے گا ہی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اس کے دل میں اس قسم کا خیال پیدا ہو گیا تو وہ بھی شرفِ انسانیت سے عاری ہو گیا۔ اس کے لئے وہ لینے والے کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس سے وہ اسے خیرات سمجھ کر نہ لے بلکہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرے۔ (فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ۔ ۲۴/۷۰) سے یہی مراد ہے)۔ برادران عزیز! یہ خصوصیت آپ کو قرآنی نظام کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ یہ اس باب میں منفرد اور عدیم النظیر ہے۔ دین کا منتہیٰ و مقصود، شرفِ انسانیت کا تحفظ اور تکریم آدمیت کی بالیدگی ہے۔ اور یہ صرف قرآن کے نظام میں ممکن ہے۔

(۶) یہ ہے دین کا وہ نظام جس کے احیاء کے لئے طلوع اسلام کی تحریک وجود میں لائی گئی ہے یعنی اس سے مقصود اس معاشرہ کی تشکیل ہے جس میں کوئی فرد کسی دوسرے کے فیصلے ماننے پر مجبور نہ ہو۔۔۔ حتیٰ کہ اور تو اور، وہ خدا کے فیصلے بھی بجبر و اکراہ قبول نہ کرے۔۔۔ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (۲۹/۱۸) اس معاشرہ کا بنیادی آئین ہوتا ہے۔ غیر قرآنی معاشرہ میں صورت حال اس کے یکسر برعکس ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو صاحب اختیار و ارادہ نہیں پاتا، ہر شخص کسی نہ کسی مجبوری کے ماتحت زندگی کے دن گزارتا ہے۔ ان میں بعض مجبوریوں کی زنجیریں تو محسوس طور پر سامنے آ جاتی ہیں لیکن بیشتر زنجیریں ایسی ہوتی ہیں جو کسی کو دکھائی نہیں دیتیں، لیکن محسوس زنجیروں سے کہیں زیادہ مضبوط اور ان کی گرفت کتنی ہی زیادہ شدید ہوتی ہے۔ ان میں جکڑے ہوئے انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

نہ دامم دانم و نے دانہ، ایں قدر دانم
ز فرق تا بقدم ہر چہ ہست در بند است

یوں تو ان زنجیروں میں پوری نوعِ انسانی جکڑے چلی آتی ہے لیکن انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے جس پر ان کی بندشیں کبھی ڈھیلی نہیں ہوئیں۔۔۔ اور وہ ہے ہمارے ہاں کا وہ طبقہ جسے عورت کہا جاتا ہے اور جسے کبھی انسان نہیں سمجھا جاتا۔ شادی سے پہلے تو ان معصوم بچیوں کو چند لمحے خوشی کے میسر آجاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ان کی حالت بالعموم ایسی ہوتی ہے جیسے کسی بکری کو باندھ کر بھیڑیئے کے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ چونکہ مجھے اس مظلوم طبقہ سے شروع ہی سے ہمدردی رہی ہے۔۔۔ کوئی جس قدر زیادہ مظلوم ہو گا، اسی قدر میرے قلب درد آگیں سے زیادہ قریب ہو گا۔۔۔ اس لئے یہ ستم رسیدہ، بے سہارا، بے کس، بے بس

مظلوم میرے پاس اسی طرح آجاتی ہیں جس طرح غم زدہ بیٹی مشفق باپ کے سایۂ عاطفت میں پناہ ڈھونڈتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہماری وہ بہنیں اور بیٹیاں جن کے لبوں پر ہم بظاہر مسکراہٹ دیکھتے ہیں، ان کی زندگی بھی اس قسم کی ہوتی ہے کہ

چپ چپ کے رووں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا ہے!

یہ بیٹیاں اپنی دکھ بھری کہانی لے کر میرے پاس آتی ہیں جسے سن کر میری راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن جب میں ان کے دکھوں کے مداوا کے لئے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں تو آپ اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ مجھ پر کیا بیتتی ہے ——— کسی باپ کو اپنی ایک بیٹی کا غم ہوگا، میرے لئے یہ سب بیٹیاں اپنی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یقین مانیے! ان کے غموں اور اپنی بے بسی نے مجھے قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ میری یہ بے بسی سب سے زیادہ ہمارے مروجہ قوانین کی وجہ سے ہوتی ہے، جن کا نہ خدا سے کوئی تعلق ہے نہ اس کے اس رسولؐ سے کوئی واسطہ جو دنیا میں رحمۃٌ للعالمین بن کر آیا تھا اور جس کا سنگِ آستان ہر مصیبت زدہ کیلئے مامن و ملجا تھا۔

میں اس مرض کی بنیادی علت کو دور کرنے کے لیے جس کی وجہ سے انسانوں کی یہ آدھی آبادی سسکیاں لے لے کر زندگی کے دن گزار دیتی ہے، اپنی سی کئے جا رہا ہوں۔ ان کی مشکلات کا حل بھی قرآنی نظامِ زندگی میں مضمر ہے۔ میری سردست کوشش یہ ہے کہ عائلی زندگی سے متعلق قوانین قرآن کے مطابق مرتب ہو جائیں۔ گزشتہ دنوں ہماری عدالت عالیہ کے چند ایک فیصلے جو صادر ہوئے ہیں، ان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ ہمارے بعض اسلام دوست، فاضل جج صاحبان بھی اس حقیقت کا احساس کر رہے ہیں کہ ان قوانین کو قرآن مجید کے مطابق ہونا چاہیئے۔ میں ان کے اس احساس پر ان کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ ان کی نگاہ کی یہ تبدیلی معاشرہ کے لئے بڑی نیک فال ہے۔

———(٠)———

میں قرآنی تحریک کے سلسلہ میں ایک اور اہم نکتہ کو بھی سامنے لانا چاہتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو احباب اس فکر سے خاصی دلچسپی لیتے ہیں، وہ بھی اکثر و بیشتر اسے ایک ذہنی تحریک سمجھتے ہیں ——— یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اور بہت بڑی خود فریبی کا موجب۔ قرآن کو بے شک سمجھا ذہنی طور سے ہی جاتا ہے، لیکن اس کا ضبط در حقیقت انسانی قلب ہے۔ اگر قرآن کا فکری طور پر سمجھ لینا، انسان کی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو اس فکری کاوش کا کچھ فائدہ نہیں ——— اگر آپ کسی نسخہ کے اجزاء کے خواص و اثرات

کا پورا پورا علم رکھتے ہیں لیکن اُسے استعمال کر کے اپنے مرض کا ازالہ نہیں کرتے تو اس نسخہ کے متعلق آپ کی یہ معلومات آپ کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے، میرا مقام داعی کا نہیں، ایک مبلغ کا ہے۔ اس لئے میں دوسروں کا محاسبہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو حضرات قرآنی فکر کو ذہنی عیاشی سے آگے نہیں بڑھاتے، انہیں اس خود فریبی سے ضرور نکالنا چاہتا ہوں کہ اگر اس فکر سے آپ کے کردار میں بلندی اور سیرت میں پاکیزگی نہیں پیدا ہوتی تو آپ اس کاوش میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ آپ کا مستقبل، آپ کے علم سے نہیں، اخلاق سے سنورے گا۔ یوں بھی جس کا کردار پاکیزہ نہیں، وہ قرآن کو کما حقہٗ سمجھ بھی نہیں سکتا۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) اس کے لئے خدائی سند موجود ہے کہ جس کے قلب و نگاہ میں پاکیزگی نہیں اسے اس قرآن سے کیا مس ہو سکتا ہے۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جس کا متلاشی اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ

ہم دل کا دیا جلا کے لائے
تب جا کے ترا سراغ پایا

اگر آپ کے "دل کا دیا" نہیں جل رہا تو آپ کے ماتھے کی آنکھوں کی بصارت آپ کو راستہ نہیں دکھا سکتی اور دل کے دیئے کی لَو کا مظاہرہ انسان کی سیرت و کردار سے ہوتا ہے۔ اسی لَو سے اس کی اپنی زندگی کی راہیں روشن ہوتی ہیں، اور یہی دوسروں کے لئے بھی تنویرِ راہ بنتی ہے۔

یہ تو رہا قرآنی تعلیم کو خود سمجھنے کا معاملہ۔ لیکن جس نے اس تعلیم کو دوسروں تک پہنچانا ہو، اس کی ذمہ داری اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے جب جماعتِ مومنین سے کہا تھا کہ "تمہارے لئے رسولؐ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے" تو اس میں داعی الی القرآن کی اس ذمہ داری کی طرف بھی اشارہ تھا۔ یعنی اس کی زندگی ایسی ہونی چاہیئے جو دوسروں کے لئے نمونہ ہو۔ اس باب میں حضور نبی اکرمؐ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے — اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ مقام ہے جس میں حضورؐ کی رفعتِ شان اور عظمتِ مقام جگمگاتے ستاروں کی طرح نور پاش نظر آتا ہے۔ خدا نے تو یہی کہا تھا کہ تمہارے لئے رسولؐ اللہ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ یعنی رسولؐ اللہ کی دعوائے رسالت کے بعد کی زندگی۔ لیکن خود رسولؐ اللہ نے جماعتِ مومنین سے نہیں بلکہ اپنے مخالفین سے علی الاعلان فرمایا کہ — فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶) میں نے اپنے دعوائے رسالت سے پہلے بھی اپنی ساری عمر تمہیں لوگوں میں گزاری ہے۔ ذرا عقل و ہوش سے کام لے کر سوچو تو سہی کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے اور فریب کار کی ہوتی ہے یا سچے اور راست باز کی — یہ ہوتی ہے ایک داعیٔ حق و صداقت کی زندگی — اگر آج، قرآن کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانے والے اپنی سابقہ زندگی

کے متعلق یہ دعوے نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کی آئندہ زندگی تو ایسی ہونی چاہیئے جو قرآنی تعلیم کی آئینہ دار ہو۔

اور یہیں سے میں آپ کی نگاہ کا رُخ دوسری طرف پلٹنا چاہتا ہوں۔ جب آپ کے سامنے کوئی شخص قرآنی پیغام پیش کرے تو آپ یہ کہہ کر اس سے بے اعتنائی نہ برتیئے کہ تم پہلے اپنے کردار کو اس کے مطابق درست کرو، پھر دوسروں کو اس کی تلقین کرنا۔ یہ ذہنیت غلط ہے اور اس سے آپ اپنی اصلاح کبھی نہیں کر سکیں گے اگر کہنے والا خود اپنی اصلاح نہیں کرتا تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ لیکن اگر آپ اس کی صحیح تنقید اور قرآنی پیغام کے سامنے آجانے کے باوجود اپنی اصلاح نہیں کرتے تو اس کا نقصان آپ کو ہوگا۔ اُس کی غلط روی آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گی ؎

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵)

تم پر تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔ اگر تم صحیح راستے پر چل رہے ہو تو وہ شخص جو غلط راستے پر چل رہا ہے، تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اس لئے عزیزانِ من! اس باب میں خاص احتیاط برتیئے اور دوسرے کی غلط زندگی کو اپنی عدم اصلاح کے لئے وجہ جواز نہ بنا لیجئے۔ یہ خود فریبی ہوگی۔

اس کنونشن میں، عزیزانِ من! میں آپ کے لئے جو تحفہ پیش کر سکتا ہوں، یا بالفاظِ صحیح یوں کہیئے کہ آپ احباب نے جو تحفہ مجھے پیش کیا ہے وہ میری انگریزی تصنیف

"ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION"

ہے۔ میں اس کتاب کا تذکرہ خاص طور پر اس لئے کر رہا ہوں کہ میں خود بھی ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا، اور قرآنی تعلیم سے تعلق رکھنے والے دیدہ ور طبقہ کا بھی یہی خیال تھا کہ بیرونی ممالک، بالخصوص یورپ، امریکہ وغیرہ کو اس پیغام سے آشنا کرانا نہایت ضروری ہے، اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنا لٹریچر انگریزی زبان میں شائع کریں۔ میرے اس احساس کی شدت اور بھی بڑھ جاتی تھی جب اُن ممالک سے آنے والے اربابِ فکر و اصحابِ قلم مجھ سے ملتے۔ میں اُن سے قرآنی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرتا تو ان کا تقاضا ہوتا کہ اس فکر کو ان ممالک تک پہنچانا نہایت ضروری ہے۔ بایں الحمد کہ یہ تقاضا اِمسال پورا ہو گیا اور میری یہ کتاب شائع ہو کر منظرِ عام تک آگئی ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ اس کی کافی تعداد میں کاپیاں ان ممالک کے اربابِ فکر و نظر کی خدمت میں تحفۃً پیش کر کے انہیں دعوتِ غور و تدبر دی جائے۔ مجھے امید واثق ہے کہ ہماری یہ کوشش اچھے نتائج پیدا کرے گی۔

اس کتاب کا مسودہ تو ایک عرصہ سے تیار رکھا تھا لیکن اس کی طباعت کا مرحلہ بڑا دشوار گذار اور

ہمت طلب تھا۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف میں قطعًا باک نہیں۔ بلکہ میں اس کے اظہار میں بے حد فخر و مسرت محسوس کرتا ہوں کہ اگر میرے بعض مخلص احباب کی ہمت و کاوش شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ کتاب منظرِ عام تک کبھی نہ آسکتی۔ ان احباب میں، سرفہرست، عزیزانِ محترم طالب حسین، خالد اسلام اور شیخ عبدالحمید کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ انہوں نے جس محنت و کاوش اور خلوص و محبت سے، دن رات ایک کرکے، اسے طباعت کے مراحل سے گزارا ہے، اسے عشق کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ اے عزیزانِ محترم! آپ کا فکرِ قرآنی سے یہ والہانہ عشق، میرے لئے باعثِ فخر بھی ہے اور قابلِ رشک بھی ؎

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

اس سلسلہ میں آپ حضرات کی اطلاع کے لئے عرض کردوں کہ مفہوم القرآن کا انگریزی ترجمہ بھی ایک عرصہ سے مکمل ہوچکا ہے اور مسودہ کی شکل میں محفوظ رکھا ہے۔ وہ اس کتاب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ضخیم اور اس کے ساتھ ہی اہم بھی ہے۔ سردست تو مشکل نظر آتا ہے شاید آگے چل کر اس کی طباعت کی بھی کوئی صورت پیدا ہوجائے۔

میری زندگی کی آخری آرزو ایک قرآنی درسگاہ کا قیام تھی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ میں کچھ ایسے نوجوان طالب العلم تیار کرجاؤں جو اس چراغ کو میرے بعد، نہ صرف روشن رکھ سکیں بلکہ فروزاں تر کریں۔ لیکن اس کے راستے میں جو موانع ہیں انہیں قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری، محترم شیخ سراج الحق صاحب اپنی رپورٹ میں آپ احباب کے گوش گزار کرینگے۔

لیکن ان موانع و مشکلات کے تذکرہ سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ میں خدانخواستہ کسی طرح بھی مایوس ہوں۔ قطعًا نہیں ؎ جس کے سینے میں قرآن کا چراغ روشن ہو، مایوسی کی ظلمت اس کے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جو پروگرام ہم اپنے سامنے رکھیں، اس کی ہر کڑی ہمارے اندازے کے مطابق کامیابی سے ہمکنار نہ ہو۔ لیکن اس میں سے جتنا کچھ بھی ہم کرسکے ہیں یا کرسکیں گے، ہماری خوش بختی کے لئے وہ بھی کچھ کم نہیں۔

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

آخر میں، میں اس مہیب اور خطرناک لیکن (بظاہر) بڑی خوشنما اور دیدہ زیب چٹان کی نشاندہی ضروری

سمجھتا ہوں جس سے ٹکرا کر دنیا کی بڑی بڑی تحریکوں کی کشتی پاش پاش ہوئی ہے اور ہوگی۔ ایک داعیِ انقلاب ایک پیغام دیتا ہے جو اس کی تحریک کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے۔ وہ پیغام صاف۔ واضح اور متعین ہوتا ہے۔ جب تک وہ تحریک اس پیغام کے ساتھ وابستہ رہتی ہے، زندہ اور متحرک رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں دنیا سمجھتی ہے کہ وہ اُس بانیٔ تحریک کے بہت قریب تھے، بہت سی باتیں اس کی طرف منسوب کر کے ان کا چرچا عام کر دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایسا کچھ بدنیتی سے کرے۔ ان میں نیک نیت بھی ہوتے ہیں لیکن نیک نیتی اس امر کی ضمانت تو نہیں ہو سکتی کہ کہنے والے نے بات کو صحیح طور پر سمجھا بھی ہو اور پھر اسی طرح آگے بھی پہنچایا ہو۔ نتیجہ اس کا یہ کہ رفتہ رفتہ اس داعی کی طرف منسوب کردہ روایات اصل پیغام کی جگہ لے لیتی ہیں اور یوں وہ تحریک کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

مجھے عزیزانِ من، کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے۔ میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھیرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریک طلوعِ اسلام کی طرف۔ وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لئے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

میرے عزیزانِ من! ایک بار پھر اپنے ان جذباتِ انبساط و مسرت کی تقدیم اخلاص آپ احباب کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو آپ کی تشریف آوری سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ اللہ آپ کے اس شوقِ فراواں میں مزید برکت عطا فرمائے۔ اور اس قسم کی انبساط و مسرت کی گھڑیاں بار بار لائے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

والسلام

قرآنی دعوتِ فکر کے عہد آفریں شاہکار

۱۔ لغات القرآن
یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہاں کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے' اس کی تعلیم کیا ہے' اسکی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے' یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد ۵ روپے۔ مکمل سیٹ۔ پچاس روپے ہیں۔

۲۔ اسلام کیا ہے؟
یہ مسئلے مسائل کی بات نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ قیمت دستم اعلیٰ) آٹھ روپے۔ جیب ایڈیشن۔ چار روپے۔

۳۔ سلیم کے نام
سلیم ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جسے ملا کے پیش کردہ مذہب نے دین سے متنفر کر دیا ہے۔ اس کے دماغ میں سینکڑوں اعتراضات پیدا ہوتے ہیں اور جناب پرویز ایک شفیق استاد کی طرح ان اعتراضات کا جواب خطوں کی شکل میں دیتے ہیں۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے تین حصے ہیں۔ قیمت حصہ اول آٹھ روپے حصہ دوم سوم چھ چھ روپے

۴۔ نظامِ ربوبیت
نظام سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا دیا۔ کمیونزم نے اس جہنم کو ٹھنڈا کرنا چاہا لیکن اس کے شعلے اور تیز ہو گئے۔ کیا ان حالات میں انسان کی نجات کی کوئی صورت ہے؟ ضرور ہے اور وہ قرآن کے معاشی نظام میں ہے جس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ یہ ہمارے دور کی ایک انقلاب آفریں کتاب ہے۔ قیمت۔ چار روپے۔

۵۔ خدا اور سرمایہ دار
موضوع کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے۔ ہمارا دور عصر معاشیات کہلاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ دنیا کے مروجہ معاشی نظاموں کا تجزیہ کر کے ان کا مقابلہ قرآن کے معاشی نظام سے کیا جائے۔ اس کتاب میں یہ تمام گوشے گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ قیمت۔ قسم اعلیٰ مجلد۔ نو روپے۔ قسم دوم۔ پانچ روپے۔

۶۔ سلسبیل
قرآنی بصیرت کا چشمۂ رواں یعنی جناب پرویز کے حیات آور مقالات کا مجموعہ۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ قیمت ــــ آٹھ روپے

۷۔ بہارِ نو
یہ مقالات کے مجموعے کا دوسرا حصہ ہے جس سے ذہن میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ سستا ایڈیشن۔ قیمت۔ پانچ روپے۔

۸۔ اسبابِ زوالِ امت
ملا کہتا ہے کہ ہم نے مذہب چھوڑ دیا ہے اس لئے ہم ذلیل ہیں۔ مسٹر کہتا ہے کہ ہماری ذلت کی وجہ ہی ہمارا مذہب ہے۔ یہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ صحیح بات کیا ہے۔ اسے معلوم کرنے کیلئے اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔ قیمت دو روپے

۹۔ اسلامی معاشرت
اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ انداز بیان سلیس اور دلچسپ۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت دو روپے۔

۱۰۔ قرآنی فیصلے
زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اول ۔ ۳/۲۵ ، جلد دوم ۔ ۲/۲۵ ، جلد سوم ۲/۰۰ روپے

۱۱۔ قرآنی قوانین
ایک نہایت جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ وکلاء حضرات اور جج صاحبان کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے ــــ قیمت ۲/۰ روپے

۱۲۔ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں
تمام مذاہب عالم کی مقدس آسمانی کتابوں کی کہانی۔ وہ کیسے مرتب ہوئیں، کن کن مراحل سے گزریں اور آج ان کی حالت کیا ہے۔ قیمت ۳/- روپے

۱۳۔ جہاد
اسلام کے اہم ترین اور اس کے ساتھ ہی نازک ترین موضوع مختصر لیکن جامع کتاب۔ اسلامی لڑائیوں کے متعلق معترضین کے اعتراضات اور ان کے مدلل جواب۔ قیمت۔ دو روپے۔

۱۴۔ پاکستان کا معمار اول
ہماری نئی نسل سرسید کے عظمت مقام سے ناواقف ہے۔ اس کی سیرت و کردار اور مسلمانوں کے لئے اس کی خدمات کا تعارف نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ قیمت ۳/۰ روپے۔

۱۵۔ عربی خود سیکھیے
قرآن کریم کو خود سمجھنے کے لئے عربی زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اس لئے ایک ایسی مختصر اور سلیس سی کتاب کی ضرورت تھی جس سے اردو جاننے والے حضرات تھوڑی سی محنت سے اتنی عربی سیکھ جائیں جس سے قرآن کریم آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ یہ کتاب اس مقصد کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۔ ۴/۵۰ روپے

۱۶۔ مقام حدیث
وہ کتاب جس نے قرآن کریم اور احادیث نبوی کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے ذہنوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے اٹھا دیئے۔ حدیث کا صحیح مقام کیا ہے؟ حدیثوں کو کس نے جمع کیا؟ یہ ہم تک کیسے پہنچیں؟ ـــ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے۔ رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب کے اندر اس قدر معلومات ہیں جو آپ کو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت ۔ ۴/ روپے۔

۱۷۔ الفتنۃ الکبریٰ
مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مؤرخ طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمان کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ ـــ قیمت چھ روپے۔

ـــ یہ کتابیں اور پرویز صاحب کی دیگر تمام تصانیف کے ملنے کا پتہ ـــ

ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام کنونشن

بزمِ مذاکرہ

منعقدہ ہفتہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۸ء بوقت ۲½ بجے دوپہر

موضوع

"نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر"

زیرِ صدارت

محترمہ بلند اختر بیگم رضا علی (کراچی)

شرکائے مذاکرہ

(۱) محمد مسعود ـــــ طالب العلم جماعت پنجم

(۲) خالد اسلام ـــــ پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی

(۳) ثریا عندلیب ـــــ لاہور

(۴) پرویز رحیم ـــــ طالب العلم۔ لا کالج (لاہور)

(۵) عفت خلیل ـــــ طالبہ۔ لاہور کالج

(۶) اختر عباس سعید ـــــ گورنمنٹ ٹیچرز سکول۔ کوئٹہ

(۷) عارفی سلطانہ ـــــ ایم۔ اے (فلسفہ) ایم اے (اردو) ریسرچ اسٹوڈنٹ قرآن و فلسفۂ اقبال

(۸) غلام صابر ـــــ ایم۔ اے (اردو)

(۹) سراج منیر ـــــ ایم۔ اے (اسلامیات)

(۱۰) مسرت چغتائی ـــــ ایم۔ اے (فلسفہ)

(۱۱) سلمیٰ خلیل ـــــ بی۔ اے۔ فاضل عربی۔

(۱۲) فریدالدین احمد ـــــ طالب العلم اسلامیہ کالج

(۱۳) غزالہ خان ـــــ طالبہ ایم۔ اے

(۱۴) صحن خانہ پرویز کی دو بچیاں
بچہ کوثر ـــــ سلمیٰ پرویز

قلتِ وقت کی وجہ سے غلام صابر اور سراج منیر صاحب کے مقالات پڑھنے کی باری نہیں آسکی تھی۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ اس دفعہ مقالات کی کثرت اور طلوعِ اسلام میں گنجائش کی قلت کی وجہ سے تمام مقالات درج نہیں کئے جا سکے۔

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

محمد مسعود

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

صدر گرامی قدر و معزز سامعین! یہ ہے وہ حکم جو مجھے آپ کی بارگاہ سے ملا ہے۔ اور شاید آپ خیال کر رہے ہوں گے کہ میں ابھی مٹھی کھول کر آپ کو نئے صبح و شام دکھا دوں گا۔ لیکن یہ حکم دینے سے پہلے اتنا تو سوچ لیا ہوتا کہ میں کوئی جادوگر تو ہوں نہیں کہ زندگی کے تشیب و فراز اور قوانینِ فطرت سے از خود آگاہ ہوں۔ میں تو ایک انسان ہوں اور بحیثیت انسان تو آپ کو علم ہے میں وہی کچھ بن سکتا ہوں جو کچھ آپ بنانا چاہیں۔ بہرحال میں آپ کو آپ کے فرائض یاد دلانے نہیں آیا۔ مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ جب میں نے یہ موضوع طلوعِ اسلام میں پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ نئے صبح و شام کا آخر مطلب کیا ہے۔ صبح و شام تو ہر روز پیدا ہوتے ہیں اور ہر روز نئے ہی ہوتے ہیں۔ ہر آنے والی صبح اگر نئی نہیں ہوتی تو اخبار کی سرخی کیوں بدل جاتی ہے۔ نت نئے مسائل کیوں پیدا ہوتے ہیں۔

ابا جان سے اس کی وضاحت چاہی تو انہوں نے بتایا کہ تم غور کرو تو دیکھو گے کہ زندگی ایک ہی ڈھب پہ چل رہی ہے۔ خبریں وہی ہوتی ہیں صرف عنوان بدلتے ہیں۔ لیکن جس نئی صبح کی امید تم سے کی جا رہی ہے، وہ ایک ایسی صبح ہوگی جو انسان کو ایک نئی زندگی کا پیغام دے گی۔ ایسی زندگی جس میں انسان انسان کا محتاج نہیں ہوگا۔ کسی کو کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھانا پڑے گا۔

لیکن وہ صبح پیدا کیسے ہوگی؟ میں نے پوچھا ــــ "اُس علم سے جو تم حاصل کر رہے ہو" ابا جان نے لفظِ علم پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زور دے کر کہا۔

لیکن اگر علم سے وہ صبح پیدا ہو سکتی ہے تو وہ لوگ ایسی صبح کیوں پیدا نہیں کر سکے جن کی لکھی ہوئی کتابیں ہم پڑھتے ہیں۔

لیکن بیٹے! تم ایک ایسی کتاب بھی تو پڑھتے ہو جو کسی انسان کی نہیں بلکہ خود خالقِ کائنات کی لکھی ہوئی ہے اور اس کتاب کا مقصد ہی یہ ہے کہ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا ہوں۔ ابا جان نے سمجھایا۔ لیکن بات میری سمجھ میں نہ آئی کیونکہ میری دینیات کی کتاب کے صفحہ ۲ پر اسی کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ آپ اس کتاب کی چند سورتیں زبانی یاد کرلیں تو بہت ثواب ملے گا۔ انہیں نمازوں میں پڑھیں، ماں باپ کو سنائیں ۔۔ جلسوں میں تلاوت کریں۔ اس کتاب کا پڑھنا سننا، زبانی یاد کرنا اور اس کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے لیکن ابا جی کہتے ہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہوا ہے اس پر عمل بھی کرنا ہوگا اور اس میں لکھے ہوئے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام نیکی ہے۔ حالانکہ ہماری کتاب کے صفحہ ۱ پر صاف لکھا ہوا ہے کہ اس کتاب کا ایک حرف زبان پر لانے سے دس نیکیاں مل جاتی ہیں۔ عمل وَمل کا وہاں کوئی ذکر نہیں۔ کتاب میرے پاس ہے۔ آپ چاہیں تو خود دیکھ لیں اور مجھے بتائیں کہ میں اپنے ابا جان کی باتوں پر عمل کروں یا اس کتاب پر جو میرے نصاب میں شامل ہے اور یہ واضح ہے کہ اگر میں نے اپنی کتاب کے بجائے ابا جان کی بات صحیح مان لی اور امتحان میں سوال کا جواب اس کے مطابق لکھ دیا تو میں یقیناً فیل ہو جاؤں گا اور پھر نئے صبح و شام پیدا کرنا تو ایک طرف آپ اَن پڑھ کا لیبل لگا کر مجھے انسانیت ہی کے دائرے سے خارج کر دیں گے۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ نئے صبح و شام کے چکر میں اُلجھا کر مجھے فیل نہ کروایئے۔ اور اگر آپ میں ہمت ہے اور آپ نئے صبح و شام پیدا کرنے کا عزم کر چکے ہیں تو دیجئے مجھے بھی اپنا پروگرام اور لایئے وہ درسگاہ جو ہم بچوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے تیار کر سکے ورنہ چھوڑیئے اس زبانی جمع خرچ کو اور رہنے دیجئے ہمیں اپنے حال پر۔ ہم آپ کے وہی صبح و شام پختہ تر کرتے جائیں گے۔ یہ تھیں بزرگانِ من میری گزارشات! لیکن ٹھہریئے کچھ مجھے بھی آپ سے عرض کرنا ہے۔

ہے قوم کا دل میں درد اگر — اُٹھ سامنے آ کچھ کر کے دکھا
تنظیمِ چمن کا ڈھنگ بدل — تزئینِ گلستاں کر کے دکھا
ہو لاکھ تلاطم دریا میں — کشتی کی حفاظت لازم ہے
رُخ موڑ دے بڑھتی موجوں کا — کم شورشِ طوفاں کر کے دکھا
دشوار مسائل کا حل کب — ممکن ہے زبانی باتوں سے

آنکھوں میں اگر کچھ آنسو ہیں!
زیبِ سرِ مژگاں کر کے دکھا

والسلام

ثریا عند لیبٌ

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

صدر محترم و سامعین کرام۔ السلام علیکم!

آپ کو یاد ہوگا کہ قریب ایک ہی سال پہلے کی بات ہے۔ یہی فضا تھی اور یہی دن۔ اور اسی قرآنی پلیٹ فارم سے متلاشیانِ حق نے اپنی دلی امنگوں کے جلو میں پورے جوش و خروش کے ساتھ اس فضائے قرآنی میں یہ نعرۂ صداقت بلند کیا تھا کہ "سحر ہونے کو ہے"

یہ نعرہ بجائے خویش اس حقیقت کا ضامن تھا کہ نمودِ سحر کے لئے خارجی عوامل کے ہمدوش داخلی یعنی انسانی سعی و کاوش بھی حسبِ وعدہ پیدا ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی خوشگوار اور پُرامید صورتِ حال پیدا ہو جانے کے بعد درخشاں سحر کے قریب تر ہو جانے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

لیکن اس وسیع و عریض ارضِ خداوندی پر ابتداء سے ہی حق و باطل کی جو آویزش جاری ہے اس میں ہر دور میں

شکوک — شبہات — اعتراضات

پیدا ہوتے ہیں — کس کے دل میں؟ — نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں۔
انکا جواب آپکے پاس کیا ہوتا ہے؟ — ماتھے کی شکن، گھرکی، لاحول!
کیا اس سے ان کے وہ شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟
اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ شکوک رفع ہوتے ہیں دلائل و براہین سے، علم و بصیرت سے بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشیں اور جاذب ہو۔ اگر آپ فی الواقعہ کسی نوجوان کے دل سے شکوک اور شبہات کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں — تو

اے سلیم کے نام خطوط

دیکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب آتا ہے۔

قیمت

جلد اول آٹھ روپے — جلد دوم چھ روپے — جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

یہی قانونِ ازل کارفرما رہا ہے کہ حق کے پرستاروں کو باطل پر غالب آنے اور تاریکی کی جگہ سحر لانے کے لئے صد ہزار انجم کے خون کی قربانی دینا پڑتی ہے اور جب باطل کی ابلیسیت وشیطنت افرادِ معاشرہ کے قلوب کا محاصرہ کرکے حق کے راستے میں سدِّ گراں بن جاتی ہے تو خدا کے بندوں کو اپنے مقصدِ حیات یعنی قیامِ حق کے لئے صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے جگر پاش غموں کی خونیں شاموں اور دل شکن وجان لیوا حادثات کی گھٹا ٹوپ سیاہ اندھیری راتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

ارتقائے انسانیت کے اس مسلسل جہاد میں پاکردار متقی و دردمند نفوس انسانی روپ میں بے درد حیوانوں کے پنجۂ ستم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں کہ جیتی جاگتی، ہنستی مسکراتی، عزم وعمل اور ایمان وایقان سے بھرپور، پُرحرارت زندگیاں آناً فاناً بے جان مٹی کا ڈھیر بنا دی جاتی ہیں۔ بستے بستے آسودہ حال ونیک خصال گھرانے اجاڑ دیئے جاتے ہیں۔ محبانِ صادق کی باہمی رفاقت ومسرت کے لہلہاتے پھول نوچ ڈالے جاتے ہیں۔ اطمینان وسکون چھین لیا جاتا ہے۔ جیون ساتھی بچھڑ جاتے ہیں۔ بے وقت بے موت مرنا "تقدیرِ الٰہی" بنا دیا جاتا ہے۔ دروغ گوئی و بدزبانی کے خون آشام خنجر سے پاک نہاد دلوں کے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ کم سن و نوعمر پھول سے بچے، مہکتے پھولوں کی خوشبوؤں میں سانس لینے والے ننھی کی خاردار جھاڑیوں میں الجھا دیئے جاتے ہیں۔ اس دنیاوی حیات کے ہم سفروں میں سے کسی ایک کا یہاں کا مستقبل اس کی جان لے کر یکسر ختم کر دیا جاتا ہے تو دوسرے کو زندہ رہتے ہوئے زندہ درگور ہونے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

حق وباطل کی اس جنگ میں یہ سب کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ––– اور یہ لیکن بڑا اہم ہے یعنی یہ کہ کرب واضطراب کی ان روح فرسا ساعتوں اور بے بسی وبے کسی کے اس خونچکاں وقت میں باطل کے ان اندھیروں میں نورِ سحر پھیلانے والے حال کی تباہی پر ماضی کی یادوں میں آنسو بہاتے ہوئے اپنے انفرادی غموں میں ڈوب کر گم نہیں ہو جاتے۔ وہ ہمت وحوصلہ، صبر واستقلال کھو نہیں بیٹھتے۔ ان رہروانِ حق کے سامنے ہر دم حق کا یہ فرمان ہوتا ہے ––– لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ––– اس لئے ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ وہ مایوسی واحساسِ محرومی کے جنگل میں گرفتار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی ذات کے تحفظ اور اپنی حیات کے مقصد کو بھول نہیں جاتے اور ایسے ہی ذی حس وباشعور اور جرأت مند افرادِ معاشرہ کو بہ آوازِ حق سناتی دیتا ہے، یہ پیغام سعید ملتا ہے کہ اٹھ اور "نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر"!

انسانوں کے خود ساختہ غیر حقیقی نظامہائے حیات میں جہاں دیگر سینکڑوں ناہمواریاں جگہ پالیتی ہیں وہاں ایسے تباہ کن حادثات بھی ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ مگر ان حادثات کے تحت افرادِ معاشرہ تین شقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وہ لوگ جو حادثوں کی زد سے بچے رہتے ہیں چنانچہ وہ اپنے موجودہ صبح وشام کو ہر طرح محفوظ ومامون سمجھ کر نئے صبح وشام اور نیا زمانہ پیدا کرنے کا احساس ہی نہیں رکھتے۔ شاید انہی کے لئے کسی حقیقت بین نے کیا خوب کہا ہے۔

جو نہیں آشنا مصیبت کا — درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا — جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا

وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے
اسے معلوم کیا خُدا کیا ہے

دوسری شق ان غیر ذمہ دار اشخاص کی ہوتی ہے جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر تنگی ترشی، ہر تکلیف مصیبت اسی کے حکم سے آتی ہے۔ انسان تو مجبورِ محض ہے۔ اللہ کی مرضی یہی تھی، تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ ہونی شدنی ہو کر رہتی ہے۔ بندہ بے چارہ کیا کر سکتا ہے۔ اس نہج پر سوچنے والے ہر بُرائی بھلائی کو خدا کی طرف منسوب کر کے خود نہایت ڈھٹائی سے بری الذمہ ہو جانے والے مرد و زن کے صبح و شام میں کیا تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ان میں ظالم بھی ہوتے ہیں مظلوم بھی اور ہر انسانی نیک و بد فعل کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں ظالموں کو ظلم و ستم ڈھائے چلے جانے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔ ان کے ہاتھوں ستائے جانے والے انسانوں کی تعداد میں شب و روز اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور مظلوم بیچارے اس لئے کچھ کہنے کچھ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے کہ آخر خدا کی مرضی کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال ہو سکتی ہے؟ یوں معاشرے کی بے لگامی زور پکڑتی چلی جاتی ہے اور اس ستم کے زیر دست و زیر دست لوگ نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔

لیکن اسی معاشرے میں ایک تیسری شق بھی ہوتی ہے اور اس میں خدا کے وہ بندے شامل ہوتے ہیں، جو ستمہائے روزگار کا شکار ہو کر اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ خدا کی کتاب قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق وہ جانتے ہیں کہ اس کجروی کی تمام تر ذمہ داری معاشرے اور اس کے غلط نظام پر عاید ہوتی ہے۔

ان حادثوں کے اثرات و عواقب جن مصائب کی شکل میں انسانی زندگی پر نازل ہوتے ہیں ان میں ایک تو خارجی مشکلات ہوتی ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا اور گہرا اثر انسان کے اپنے اندرونی جذبات پر مرتب ہوتا ہے۔ صحیح قرآنی اندازِ فکر رکھنے والے افراد ایسے سانحوں کی لپیٹ میں آجانے کے بعد اپنے سلگتے، سسکتے جذبات کے نیچے دب کر ان کو محض انفرادی غم بنا لینے کی بجائے انہیں غلط معاشرے کے خلاف انقلابی جذبات میں ڈھال لیتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو زمانے کو اس کے سابقہ صبح و شام پر چلتے چلے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس تگ و دو میں اگرچہ ان بے خطا بندگانِ خدا کو غلط معاشرے کی بے راہ روی کے کارن ناکردہ گناہوں کا عذاب بھگتنا پڑتا ہے، ان کی بے داغ زندگی کی سیدھی و ہموار رہگذر پُر پیچ و کج مج پگڈنڈیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے، ان کا مستقبل کلیتہً خراب ہو جاتا ہے، لیکن زندگی کے اسی نازک و خطرناک مقام پر صراطِ مستقیم کے راہی اپنی منزل کا نشان پاتے ہیں۔ وہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں قرآن کے اس ازلی و ابدی پیغام کو گوشِ ہوش

سے مل کر نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کا عزمِ صمیم کرتے ہیں۔ اور یہ عزم وہی کر سکتے ہیں جن کی اپنی ذات پختہ ہو اور وہ اسے خدا کی مرضی کہہ کر مجبوری اور بے بسی کی تصویر نہ بن جائیں وہ انسانیت کے وقار کی حفاظت کے لئے نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنا اپنا فرض قرار دیتے ہیں اور یقینِ محکم کے ساتھ وہ راہِ عمل اختیار کرتے ہیں کہ جس سے ہر صبح نئی صبح اور ہر شام نئی شام بن کر جلوہ پذیر ہوتی ہے۔ یوں وہ اپنے معاشرے کو ناہمواریوں کے اندوہناک اندھیروں سے نکال کر توازن بدوش حسن کارانہ زندگی کے تابناک اُجالوں سے روشناس کرلتے ہیں۔

قرآنی ذہنیت کے حامل انسان اپنے ربّ کی طرف سے عائد کردہ فرائض سے اجتناب نہیں برتتے، اپنی ذمہ داریوں سے گریز نہیں کرتے۔ اس لئے وہ کبھی یہ فریب نہیں کھاتے کہ غلط نظام کو خدا ہی بدلے گا تو یہ بدلے گا۔ ہم اسے نہیں بدل سکتے۔ نئے صبح و شام پیدا کرنے سے تو مراد ہی یہ ہے کہ معاشرے کے غلط نظام میں صحیح تغیر پیدا کیا جائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ یعنی جب تک کوئی قوم خود اپنی نفسیاتی کیفیت نہیں بدلتی اس کی حالت میں تبدیلی نہیں آتی"۔ اور اس موقع پر یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ "تم حسن پیدا کرنے والے کام کرتے جاؤ، بگاڑ خود بخود رفع ہو جائے گا۔ اور یہ کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ۔ اگر تم بہت زیادہ ہمواریاں پیدا کرو گے تو ناہمواریاں خود بخود مٹ جائیں گی۔ غلط نظام کو بدلنے والے انقلابی روح والوں کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ "وہ سیئات کو حسنات کے ذریعے دور کر دیتے ہیں۔ اور یہ کام مل کر ہوتا ہے۔ یہ فریضہ جماعت کی صورت میں سرانجام دیا جاتا ہے۔ کیونکہ محض انفرادی طور پر کسی برائی، کسی ناہمواری کو چھوڑ دینا اور صرف اپنی ذات سے اچھا بن کر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا معاشرے میں انقلاب نہیں لایا کرتا۔ برعکس اس کے غلط معاشرے میں ہوتا یہ ہے کہ ایک آدمی کا غلط عمل دوسرے آدمی کے صحیح عمل کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ دن رات کے یہ حادثات یوں ہی تو رونما ہوتے ہیں ناگہانی تباہیاں یوں ہی تو نازل ہوتی ہیں۔ اس لئے جب تک کسی ایک فرد کی راست روی دوسرے فرد کی راست روی کا سبب نہیں بنتی، نہ کسی معاشرے کی تطہیر ہو سکتی ہے نہ اس میں صالح تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ کے عطا کردہ وحدتِ انسانیت کے زریں اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ہی افرادِ معاشرہ فردِ واحد بن کر نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کر سکتے ہیں۔ بغیر اس کے ہر اچھائی بُرائی ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کے رہ جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرے کی ہر صبح تیرہ و تار ہوتی ہے اور ہر شام ویرانی کی منہ بولتی تصویر۔ اس معاشرے میں بسنے والے بسنے کو بستیوں میں بستے ہیں لیکن جس پر پڑتی ہے وہ اپنے آپ کو بیابان میں کھڑا محسوس کرتا ہے۔ یہاں تنہا رہ جانے والے کی پھنسی ہوئی گاڑی کو باہر نکال کر چالو کرنے والا کوئی نہیں ملتا۔ اس معاشرے کی ناہمواریوں سے جب انسانیت پر کوئی انتہائی افتاد پڑتی ہے تو اس سے مردوں کو تو خالی مشکلات کا ہی سامنا کرنا ہوتا ہے۔ لیکن

ان کی ساکھی عورتوں کو ایسے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ان کی زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ ان کے لئے صبح کی شادابیاں اور شام کی تابناکیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ زمانے کے روایتی نقطۂ نظر کے مطابق اپنے آپ کو جسدِ ناکارہ سمجھ کر نئے صبح و شام پیدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ ان کے دلوں میں کوئی حرارت باقی نہیں رہتی۔ ان کے ذہن مفلوج و منجمد ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ساری بربادی اس زاویۂ نگاہ کی لائی ہوتی ہے جو رب العالمین کے عطا کردہ ضابطۂ حیات 'قرآنِ کریم' کی حقیقی تعلیم سے ہٹ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

میری عزیز بہنو اور معزز سامعین! کیا ہماری موجودہ صبح و شام میں اسی تلخ حقیقت کی آئینہ دار نہیں؟ کیا ہمارا معاشرہ اسی بے حسی و جمود کا شکار نہیں؟

زندگی کے بیسیوں شعبے ہیں۔ اپنے موضوع کے تعلق سے میں اس ایک شعبے کو پیشِ نظر رکھ کر بات کر رہی ہوں جس کا میں نے ذکر کیا۔ اور بہنیں مجھے یہ کہنا ہے کہ اس موقع پر اپنے سلیم بھائیوں کے ساتھ ہم طاہرہ بہنوں کو بھی مایوس و مجبور اور معطل ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے درمیان نہ صرف خدا کی آخری کتاب 'قرآن' موجود ہے بلکہ خدا کے فضلِ بے پایاں سے ہمیں وہ مفکرِ قرآن بھی میسر ہے جس نے اپنی زندگی کا ہر سانس قرآنِ عزیز کی اصلی تعلیم کو علیٰ وجہ البصیرت خدا کے بندوں کے سامنے پیش کرنے میں وقف کر رکھا ہے۔ اور جس نے قرآن کے فرمان کے مطابق مردوں کے ساتھ ہم عورتوں کو بھی جینے کا راستہ دکھایا ہے۔

یہ مردِ مجاہد جسے عرفِ عام میں پرویز کہتے ہیں' ہمارے اور آپ کے باباجی ہیں جو ہمیں اپنے زمانہ کو نیا زمانہ بنانے اور نئی صبحوں کا اجالا اور نئی شاموں کا نور چار سو پھیلانے کا پیغام دے رہے ہیں۔ کیا ہم اپنے اس محسنِ حیات کی اس حقیقی راہ نمائی کا حق ادا نہیں کریں گے؟

لامحالہ زمانے کی تبدیلی کا انحصار ذہنیت کی تبدیلی پر ہوتا ہے اور صبح و شام کی نیرنگی دل کے بدلنے پر موقوف ہوتی ہے۔

> میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں' دنیا میرا دل ہے
> بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلا!

مگر دل کی وہی تبدیلی اور ذہن کا وہی انقلاب قابلِ قبول اور تعمیری ہو سکتا ہے جو وحیِ خداوندی کی متعین کردہ مستقل اقدار کے تحت رونما ہو۔ یہی انقلاب معاشرے میں صحیح نظام قائم کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔

اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا خوش بختی ہوگی کہ ہمارے اذہان کی تطہیر و تشکیل اس انمول درسِ قرآن کے ذریعے کئی سالوں سے ہوتی چلی آرہی ہے جس سے ہم ہر اتوار کو فیضیاب ہوتے ہیں اور بفضلِ تعالیٰ یہ تسلسل کبھی ٹوٹا نہیں۔ ہم اپنے باباجی کی بدولت قرآنِ حکیم کو الحمد سے لے کر والناس تک پورے کا پورا سمجھ چکے ہیں اور برابر سمجھ رہے ہیں۔

اس کی آیاتِ بیّنات کا مفہوم پوری طرح نکھر اور اُبھر کر ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کے بعد مقامِ غور وفکر یہ ہے کہ اب ہمارے فرقے کرنے کا کام کیا ہے اور ہم اس صبح وشام کو بدلنے میں کس طرح حصّہ لے سکتے ہیں۔

میری عزیز قرآنی بہنو اور طاہرہ بیٹیو! اس موقع پر مجھے بطورِ خاص آپ سے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ قرآن کے مفہوم اور پیغام کو اپنی دوسری بہنوں تک پہنچانے کی اپنی عظیم ذمہ داری سے گریز نہ کیجئے۔ اس وقت ہمارا فرضِ اولین یہ ہے کہ ہم مل بیٹھ کر کوئی ٹھوس اور عملی پروگرام بنائیں۔ ایک تنظیم کی صورت میں اپنی ناخواندہ اور دین سے ناواقف بہنوں کو قرآن کی تعلیم سے روشناس کرائیں۔ نئے صبح وشام پیدا کرنے کے لئے یہ پہلا قدم اٹھانے کی فوری ضرورت ہے۔ بغیر اس کے روشنیاں ہمارا مقدر نہیں بن سکتیں۔ عمل کے بغیر ایمان بے معنی ہو جاتا ہے۔ حضور نبی اکرم حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ بصیرت افروز الفاظ روشنی کا وہ مینار ہیں کہ جس سے ہم کبھی بھی راستے سے نہیں بھٹک سکتے۔ حضورؐ نے فرمایا تھا۔

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ۔

جس کے دو دن ایک جیسے گزر گئے یعنی آج جس کا قدم گزشتہ کل کے مقابلہ میں آگے نہ بڑھا، وہ سخت نقصان میں رہا۔

آخر میں مجھے یہی کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیں یہ توفیق طلب کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے آج کو گزشتہ کل سے روشن تر بنا سکیں۔ واللہ المستعان۔ والسلام!

———(۰)———

عفت خلیل

نیا زمانہ نئے صبح وشام پیدا کر

صدرِ محترمہ اور میرے بزرگو!

حسنِ اتفاق تھا کہ طالب علمی کی زندگی میں مجھے مشرق ومغرب کے متعدد ممالک میں سیر وتفریح کے دوران وہاں کے معاشرتی حالات کو قریب سے دیکھنے کا ایک موقعہ ملا۔ سالِ گزشتہ کے مذاکرے میں میں نے اپنے مشاہدات سے اخذ کردہ چند تاثرات پیش کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ آج تمام عالم میں ابھی افراط وتفریط ہی کا دور دورہ ہے۔ اور ہزار ہا کوششوں کے باوجود کہیں بھی انسان کے خود ساختہ نظامہائے حیات اسے قرآن کریم کے متعین کردہ معیار کے مطابق "خوف وحزن" سے مامون زندگی عطا نہ کر سکے۔ گویا آثار زبانِ حال سے یہ پکار رہے ہیں کہ قرآنی نظام ہی

انسانیت کا آخری سہارا بن سکے گا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

ہماری طرف سے ہمارے رسولوں کی معرفت تمہاری طرف راہ نمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔

چونکہ قرآن کریم کے اٹل قانون "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" کے تحت کسی قوم کی حالت نہیں بدلی جا سکتی جب تک اس کے افراد اپنے اندر مناسبِ حال نفسیاتی تبدیلی خود عمل میں نہ لائیں۔ اس لئے میں یہ سمجھتی ہوں کہ آج کے مذاکرے کا عنوان قرآن کریم کی اس مستقل قدر کے عملی پہلو کی نشاندہی کر رہا ہے۔

میں اپنی بساط کے مطابق بتلانا چاہتی ہوں کہ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرنے کے لئے ہماری طالباتِ علم اور میری بہنیں اپنی سیرت کو کن اوصاف سے مزین کر کے قرآنی معاشرہ کے جلد از جلد قیام میں مدد و معاون ہو سکتی ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ زمانۂ قدیم سے جس طرح اور مذاہب و اقوام و ملل نے عورت کو معاشرہ میں مردوں کے مقابلہ میں ایک نہایت ادنیٰ مقام دے رکھا تھا مسلمانوں نے بھی، خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، وراثت، ماحول، تعلیم اور تربیت کے مجموعی اثرات کے ماتحت مروجہ قوانین ایسے ہی بنا لئے جس میں مردوں کو ہر حال میں بالادست رکھا گیا اور عورت کو ان کے مقابلہ میں پست حیثیت دے دی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ قوانین اُس دورِ ملوکیت کی پیداوار ہیں جبکہ زندگی کے ہر گوشہ میں استبداد ہی استبداد تھا، عدل کہیں نہیں تھا۔ یعنی حکومت جس کی لاٹھی اس کی بھینس" یا (MIGHT IS RIGHT) کی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمارے اربابِ مذہب نے قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کی غلط تعبیر سے ان پر مہرِ ثبت کر دی۔

مسلمانوں میں اس ذہنیت کے سرایت کر جانے کے اسباب ہیں ہمارے مروجہ اسلام پر مجوسیوں کے تصورات اسرائیلیات اور عیسائیوں کی رہبانیت کا اثر شامل ہے جس کی رو سے عورت سخت قابلِ نفرت شے قرار پائی تھی۔ نتیجۃً ہمارے ملوکیت کے دورِ اسلامی تمدن میں یہ تذلیل یہاں تک پہنچی کہ سامان کی طرح عورتیں بازاروں میں نیلام ہوتی تھیں۔ چونکہ ان کی خرید و فروخت شریعت کی رو سے جائز قرار دے دی گئی تھی۔ اس طرح مردوں کی یہ خود ساختہ شریعت صدیوں سے معاشرہ کا چلن بن چکی ہے۔ مرورِ زمانہ سے عورتوں میں خود بھی غیر شعوری طور پر یہ احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) پیدا ہو گیا اور یہ غیر قرآنی تصور ان کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو گیا۔

قرآن کریم کا خطاب — یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ — ہر انسان سے ہے۔ اُس نے جب انسان کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہونے کا اعلان کیا تو اُس میں مرد اور عورت کی تخصیص نہیں کی۔
اِنَّا کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ میں مرد اور عورت دونوں یکساں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں محاورۂ زبان کے لحاظ سے جمع کے صیغہ میں عموماً مذکر بولتے ہیں اور جب تک تخصیص نہ کی جائے اس سے مراد مذکر و مؤنث دونوں ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ عقاید قرآن کریم کی تعلیم کو مسخ کر کے وضع کئے گئے تھے جس کے وجوہ مختصراً وہ ہیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکی ہوں۔ یہ عورت کے مقام کے متعلق اِس مسخ شدہ تعلیم ہی کا نفسیاتی اثر ہے جو وہ اپنی نمود و نمائش کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ اور قرآن کریم نے جو اِس نمائش کے مواقع کو محدود کیا ہے تو اس سے مقصود یہی ہے کہ عورت اپنے مقام بلند سے جو کسی طرح بھی مرد سے کم نہیں ہے' آگاہ ہو جائے گویا وہ اس پر واضح کر دینا چاہتا ہے کہ یہ اُس کے شرفِ انسانیت کی گراوٹ ہو گی اگر وہ قامتِ انسانیت پر اپنا مقام حاصل کرنے کی بجائے مرد کے لئے کھلونا بنی رہے۔

مغرب کی تہذیب نو عیسائیت کے اس مسلّہ عقیدہ کو تیاگ کر کر عورت ایک قابلِ نفرت شے ہے' اور اس سے دور رہنا یعنی تجرد یا رہبانیت کی زندگی ہی معراجِ انسانیت ہے' بادی النظر میں اب عورت کے احترام اور برتری (یعنی (BETTER HALF) کی رٹ اپنا معمول بنا رہی ہے لیکن حقیقت و مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ مغربی معاشرہ میں آج بھی ہر وہ عورت جو اُن کے معیار کے مطابق کامیاب ازدواجی زندگی سے محروم رہ جاتی ہے' یا بطور سیلز گرل (SALES GIRL) رقاصہ، فلم آرٹسٹ یا کسی استقبالیہ (RECEPTION) اسامی میں فِٹ نہ ہو سکے' اُس کے لئے ادنیٰ درجہ کی مزدوری جس میں اُسے مردوں سے بہت کم اُجرت پر کام کرنا پڑتا ہے جیسے ہوٹلوں کے کمروں کی صفائی کرنے والی یا نرسنگ ہوم کی خادمہ وغیرہ بن کر بسر اوقات کرنا ناگزیر ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کا بظاہر اعزاز اُس معاشرہ میں حُسنِ صورت تک محدود ہے حالانکہ مستقل اقدار پر نگاہ رکھنے والی تہذیب کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے ؎

حسنِ رخسار دمے ہست دمے دیگر نیست
حسنِ کردار و خیالاتِ خوشاں چیزے ہست

اس لئے میں اپنی اُن بہنوں سے جن کا قرآنی نظامِ ربوبیت کے علیٰ وجہ البصیرت مطالعہ کے بعد یہ ایمان الیقین کے درجہ تک پہنچ چکا ہے کہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم پر معاشرہ کی تشکیل ہی طبقۂ نسواں کی مشکلات و پریشان حالی کا صحیح علاج ہے اور انہیں ان کے صحیح مقام عطا کرنے کا ضامن ہو سکتا ہے' یہ گزارش کرتی ہوں کہ اگر وہ طالب علمی کے زمانہ سے شروع کر کے یعنی بحیثیت ایک بیٹی، ایک بیوی، ایک ماں اور ایک معلّمہ کے قرآن کریم کے غیر متبدل

احکام کے مطابق عمل پیرا ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں کہ جب یہ معاشرہ جنّتِ ارضی میں تبدیل ہو جائے گا۔ وَ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ (یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھیگی)۔

وَالسَّلَامُ!

مسّرت چغتائی

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

انگریزی تقریر کا رواں اُردو ترجمہ

صدرِ محترم اور واجب التکریم خواتین و حضرات!

میں اس اسٹیج پر آپ کے سامنے، دل میں مخلوط جذبات لئے کھڑی ہوں۔ سردیوں کی شام، آتشدان کے سامنے چلغوزے کھاتے، بے تکلف دوستوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنا اور بات ہے، اور اس قسم کی محفل میں جس میں پرویز صاحب جیسے متبحر عالم اور عظیم مفکر موجود ہوں، لب کشائی کرنا چیزے دیگر۔ میں سب سے پہلے اپنے مشفق محترم پرویز صاحب کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھ ایسی ایک طالب العلم کو اس مجلس میں اظہارِ خیال کے قابل سمجھا ہے۔

اس سے پہلے بھی یہی صورت رہی ہے اور آج بھی یہی کیفیت ہے کہ بزمِ مذاکرہ کی تقاریر، اکثر و بیشتر اردو میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ طلوعِ اسلام کی کشادہ نگہی ہے کہ اس نے انگریزی زبان کو شجرِ ممنوعہ قرار نہیں دیا، اور ان طلبا کو جو —— ایسے حالات کی بنا پر جن پر انہیں اختیار نہیں —— اپنے مافی الضمیر کو انگریزی زبان میں بہتر طریق سے پیش کر سکتے ہیں، اس کی آزادی دے رکھی ہے۔ میرا شمار بھی انہی طلبا میں ہے اور اس کے لئے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ اس لئے کہ میں انگریزی زبان میں اظہارِ خیالات سے نہ تو اپنے آپ کو گنہگار خیال کرتی ہوں، نہ غیر محبِّ وطن —— اور نہ ہی اس سے میری ذات میں کسی قسم کا انتشار واقع ہوتا ہے۔

آج کے مذاکرہ کا موضوع، درحقیقت، روایت پرستی اور تجدد پسندی پر تبصرہ ہے، اور یہ عنوان بجائے خویش، ان دونوں کے تصادم کی ایک بیّن مثال ہے۔ ہماری موجودہ نسل نے اس حقیقت کو سمجھا لیا ہے کہ زندگی وہی زندگی کہلانے کی مستحق ہے جس میں حرکت ہو، توانائی ہو، ارتقا ہو ——— وہ زندگی جس کی ہر صبح اپنے افق پر جدید اور حسین ترین رنگوں کی قوسِ قزح لے کر نمودار ہو، اور ہر شام نئی کامرانیوں کے تحائف اپنے دامن میں لئے، رخصت ہو۔

یہ مقاصد جلیلہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم تلاشِ حقیقت کے لئے تعصبات کی تنگ ناؤں سے نکل کر علم و بصیرت کی کشادہ وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی ہو جائیں۔

اس مقام پر، ایک جویائے صداقت کے دل میں جو سوال سب سے پہلے ابھرتا ہے، یہ ہے کہ قدیم اور جدید میں بالآخر یہ تصادم کیوں؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس تصادم ۔۔۔ یا یوں کہیے کہ قدامت پرستوں کی طرف سے نژادِ نو کو بہرحال مردود و مطعون قرار دینے کے جذبہ ۔۔۔ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جانے والی نسلیں جن مسائلِ حیات کو حل نہیں کر سکی تھیں، آنے والی نسل نے اس کا عزم کر لیا ہے کہ وہ، اُن گورکھ دھندوں میں اُلجھے بغیر جن میں ہماری قوم صدیوں سے ماخوذ چلی آ رہی ہے، آزادیٔ فکر اور ندرتِ عمل سے اُن کا حل دریافت کر کے رہے گی ۔۔۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے یہ بزرگ سب کے سب نالائق تھے ۔۔۔ ہرگز نہیں ۔۔۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ کشمکشِ حیات میں جہاں جہاں قدیم و جدید میں تصادم دکھائی دیتا ہے، وہاں، ہمارا قدیم طبقہ، نژادِ نو کے خلاف نبرد آزما نہیں۔ وہ درحقیقت خود اپنی ناکامیوں کے خلاف مصروفِ پیکار ہے ۔۔۔ وہ کسی دوسرے سے نہیں، خود اپنے آپ سے لڑائی لڑ رہا ہے۔ محبت یا نفرت کے جذبات کو بیدار رکھنے کے لئے، اپنے مطلوب و مقصود کے ساتھ وابستگی ضروری ہوتی ہے ۔۔۔ خواہ وہ مطلوب و مقصود کچھ اور کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ اپنی کہنہ اور فرسودہ روایات کے ساتھ جو اس قدر شدت سے پیوست نظر آتا ہے تو یہ اس لئے ہے کہ اس کے بغیر ان کے دل میں نژادِ نو کے خلاف جذباتِ نفرت، شدت اختیار نہیں کر سکتے۔ غور سے دیکھیے تو ہمارے ان بزرگوں کی یہ ذہنیت، درحقیقت، "انگور کھٹے ہیں" کے جذبات کی عکاس ہے۔ ہمارے نوجوان طبقہ کی برق آسا ذہانت اور تیز روی، ان کے سست رفتار ذہنوں پر بڑی گراں گزرتی ہے۔ زندگی کے مسائل کے مقابلہ کے لئے، ان کا طرزِ عمل بھی کبوتر کا سا رہا جو آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ بلی چلی گئی ہے۔ لیکن زندگی کے مسائل، ان سے اعراض برتنے سے تو حل نہیں ہو سکتے۔ ہماری نئی نسل نے اس اندازِ نگاہ کو بدلا ہے اور وہ ہر مسئلہ کا مقابلہ، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، کرنے کا انداز اختیار کر رہی ہے۔ اس سے اسے نت نئی کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں۔ اور اس کی یہی کامیابیاں ہمارے بزرگوں کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہی ہیں ۔۔۔ بالفاظِ دیگر، وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ جو کچھ وہ خود نہیں کر پائے تھے، ان کے بچے وہ کچھ کر دکھائیں۔ آئیے۔ دیکھیں کہ اس ذہنیت کے تابع، ہمارے بزرگ، اپنے بچوں کی تربیت کس انداز سے کرتے ہیں۔

بچے کی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ اس کے جذبات کا احترام کیا جائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کی جائے۔ لیکن ہمارے ہاں کوشش کی جاتی ہے کہ بچے میں خود اعتمادی کا جذبہ بیدار نہ ہونے پائے ۔۔۔ اسے زیادہ سے زیادہ دوسروں کا محتاج اور اپاہج بنا دیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جب اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا

نہیں ہوگی تو اسے "جذباتی تحفظ" کس طرح حاصل ہو سکے گا۔

ہمارے ہاں بچے کی ہر نقل و حرکت کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کیا جاتا ہے۔ اس سے مختلف احکامات کی اطاعت کرائی جاتی ہے ــــ کبھی ماں کا حکم، کبھی باپ کا ــــ اور دادا، دادی، اور نانا، نانی کا اس پر مستزاد ــــ اور طرفہ تماشہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا حکم دوسرے سے متضاد ہوتا ہے۔ اب آپ اس بچے کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگائیے جسے ہر آن ایک دوسرے سے متضاد احکام کی اطاعت کرنی پڑے۔ اس کا نتیجہ ــــ اعصابی کمزوری اور جذباتی اضطراب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، حالانکہ اگر اس کی تربیت صحیح ہوتی تو وہ نہایت صاف گو اور صحت مندانہ دل و دماغ کا حامل بنتا۔

یہ تو رہی عام بچوں کی حالت۔ ان میں لڑکیوں کی حالت اور بھی ابتر ہوتی ہے۔ جس بچی کی پیدائش پر ماں کے منہ سے بے ساختہ آہ نکلے، اور باپ کا چہرہ افسردہ ہو جائے، اس کی دنیا میں کیا وقعت ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد بچہ جب ذرا بڑا ہو جاتا ہے اور اس میں اپنی انفرادیت کو محسوس کرنے کا جذبہ انگڑائی لے تو پوری پوری کوشش کی جاتی ہے کہ اس کے اس جذبۂ شعورِ خویش کو کچل کے رکھ دیا جائے۔ اس وقت اس کے لئے فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر حکم کو بلا چون و چرا مانے اور خاندانی یا معاشرتی روایات کو آنکھیں بند کئے تسلیم کئے جائے۔ جو بچہ سوال کرنے کی جرأت کرے اسے ننگِ خاندان سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد بچے کے مستقبل کا سوال سامنے آتا ہے اور اس کا فیصلہ یوں کیا جاتا ہے کہ (مثلاً) اگر باپ نے پلیڈر یا ڈاکٹر بننا چاہا تھا اور وہ اس میں ناکام رہ گیا تھا تو وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین، اپنے بچے کو پلیڈر یا ڈاکٹر بنا کر کرنا چاہتا ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ بچے کے رجحانات کیا ہیں اور اس کی طبیعت کا تقاضا کیا۔ اس بے معنی کوشش میں کئی قیمتی جوہر ضائع ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح بچے کی شادی کا فیصلہ خاندان، برادری، جائیداد یا دولت کی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ مجھے یوں نظر آتا ہے کہ ماں باپ جو لڑکی کو جہیز دیتے ہیں تو یہ لاشعوری طور پر کفارہ ہوتا ہے ان کے اس ظلم کا جو وہ اس کے لئے غلط رفیقِ زندگی کے انتخاب سے اس پر کرتے ہیں ــــ اگر ماں باپ، اپنی لڑکی کو آزادیٔ انتخاب کا تحفہ دیدیں تو اس کے لئے زمرد کے گلوبند کی ضرورت قطعاً لاحق نہ ہو۔

ہماری نئی نسل، اس منافقت، جھوٹی اقدار اور معاشرتی جمود کے خلاف بغاوت کرنا چاہتی ہے۔

حال ہی میں نے اپنے ایم۔ اے (فلسفہ) کے امتحان کے لئے تھیسس لکھا جس کا موضوع تھا

IRRATIONALISM IN CONTEMPORARY PHILOSOPHY.

اس میں میں نے مطابقِ عقل (RATIONAL)، خلافِ عقل (NON - RATIONAL)' اور ماورائے عقل (SUPRA - RATIONAL) میں فرق کرکے بتایا۔ میں سوچتی تھی کہ روایت پرستی

(TRADITIONALISM) کو ان میں سے کس شق میں جگہ دوں۔ اور بعد از بسیار غور و فکر اس نتیجہ پر پہنچی کہ روایت پرستی کے لئے ان میں کوئی جگہ نہیں۔ اس لئے کہ روایت پرستی تو جمود خالص کا نام ہے اور مذکورہ بالا تینوں اقسامِ فکر اپنے نقائص کے باوجود، ایک اندازِ حرکت اپنے اندر رکھتے ہیں ـــــ یہ انسانی تجسّس کے غماز تو ہیں ـــ اس کے برعکس، روایت پرستی، انسان کی فکری صلاحیتوں کا قبرستان ہے۔ یہ ہر نوعِ فکر کے راستے میں سنگِ گراں ہے۔ انسان اگر احسنِ تقویم کے شرف سے نوازا گیا ہے تو صرف اس لئے کہ اسے اختیار و ارادہ و انتخاب کی استعداد عطا کی گئی ہے۔ جو انسان اس استعداد سے کام نہیں لیتا، اس کی مثال ایک ایسے سپاہی کی ہے جس کے پاس ہتھیار کوئی نہ ہو۔ مُلّا نے مسلمان کو خدا کے اس عطیہ عظمیٰ سے محروم کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی محفلوں میں عقیدہ تقدیر ہمیشہ زیرِ بحث رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان سے اختیار و ارادہ کی صلاحیت چھین لی جائے تو اسے اخلاقی پابندیوں سے یکسر چھٹی مل جاتی ہے۔

اس مقام پر میں آپ کی توجہ ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہتی ہوں۔ ہمارے ہاں معاشرتی اقدار اور اخلاقی اقدار کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نہ صرف یہ کہ مرادف نہیں بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتی ہیں۔ معاشرتی اقدار کی حیثیت اس کے سوا کیا ہے کہ کسی زمانے میں، معاشرہ نے کسی نظریہ یا رسم کو اچھا سمجھ کر اسے اختیار کر لیا اور اس کے بعد وہ متوارث منتقل ہوتی ہوئی ہم تک آ پہنچی۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اس کے صحیح، غیر متبدل یا مقدس ہونے کی کوئی سند نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معاشرتی رسم و رواج کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یوں دہائی مچا دی جاتی ہے جیسے اس سے کسی اخلاقی جرم کا ارتکاب ہو گیا ہو۔ اس کے برعکس، جو شخص معاشرتی رسوم و قیود کا پابند ہو، اسے معاشرہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے خواہ اس کی اخلاقی حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ اس معاشرتی پابندی کے مستحسن ہونے کی سند کیا ہے، تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ قدامت پرستی کی یہ ذہنیت، فکری تجسّس اور عقلی کاوش کے اس بلند جذبہ کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے جو اسلام کی منفرد خصوصیت تھی۔ اے کاش! ہمارے یہ "اقدار" کے خدائی فوجدار اتنا سمجھنے کی صلاحیت رکھتے کہ کسی بات کو ڈنڈے کے زور یا اندھی تقلید کی رُو سے منوانے اور اسے عقل و فکر اور علم و بصیرت کی بنا پر ماننے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ جس دن ہمارے معاشرہ نے اس فرق کو سمجھ لیا، وہی ہماری قوم کے نئے زمانے اور نئے صبح و شام کی ساعتِ سعید ہو گی۔ خدا کرے کہ وہ ساعتِ سعید جلد نمودار ہو۔

میں، خواتین و حضرات! روایت پرستی اور منتقل اقدار کے فرق کو بھی نمایاں کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ میں نے جو روایت پرستی کی مخالفت کی ہے تو اس سے، یہ نہ سمجھ لیا جائے، یا ایسا تاثر پیش نہ کر دیا جائے کہ میں منتقل اقدار کی مخالف ہوں۔ میں نے اس سے پہلے، معاشرتی اقدار اور اخلاقی اقدار میں فرق کر کے بتایا ہے۔ بس جو فرق ان میں

ہے وہی فرق روایت پرستی اور مستقل اقدار میں ہے۔ روایت پرستی معاشرتی اقدار کے ملغوبہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس کے برعکس، مستقل اقدار وہ غیر متبدل بنیادیں ہیں جن پر اخلاقیات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دیانتداری ایک مستقل قدر ہے لیکن آج ہمارے معاشرہ میں دیانتدار کو بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب مستقل اقدار کا احترام باقی تھا، تو دیانتداری معاشرہ میں وجہ تکریم اور باعث احترام تھی۔ لیکن اب دولت اور صرف دولت معیارِ عزت قرار پا چکی ہے۔ خواہ اسے کسی طریق سے حاصل کیا گیا ہو۔۔۔ آج کس بیباکی سے کہا جاتا ہے کہ ایک شخص دیانتدار رہتے ہوئے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سوچئے کہ یہ صورت حال ایک معاشرہ کے لئے کس قدر شرمناک ہے لیکن ہمارا معاشرہ اس میں قطعاً کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔

یاد رکھیے! آج کا نوجوان مستقل اقدار سے سرکشی نہیں برتنا چاہتا۔ وہ غلط معاشرتی قیود کے خلاف بغاوت کرنا چاہتا ہے اور چونکہ ہمارے ہاں معاشرتی اقدار ہی کو مستقل اقدار سمجھا جاتا ہے اس لئے دہائی دی جا رہی ہے کہ ہماری نئی نسل اخلاقیات سے باغی ہوتی چلی جا رہی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ مسلمان ہونے کی جہت سے ہمارے پاس ایک ایسا خارجی معیار ہے جو غلط اور صحیح میں امتیاز کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور وہ معیار ہے خدا کی زندہ و پائندہ کتاب۔ جو کچھ اس کے مطابق ہے وہ حق ہے، صداقت ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے، غلط ہے، خواہ آپ کے روایتی معیار اور معاشرتی اقدار کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔

خدا کی یہی وہ کتاب عظیم ہے جو ایک متحرک اور توانا زندگی کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔۔۔ ایسی زندگی جس میں آپ وقت کی شاہراہ پہ سفر کرتے بوڑھے نہیں ہوتے۔ بلکہ ارتقاء کی اگلی منزل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ارتقاء کی ہر نئی منزل ہی ہے جو نیا زمانہ اور نئی صبح و شام پیدا کرتی ہے۔ جمود کے قبرستان میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام۔　والسلام!

غزالہ خان

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

انگریزی تقریر کا رواں اردو ترجمہ

صدر محترم۔ خواتین و حضرات!

گزشتہ اتوار ہمارے ہاں ایک مشنری تشریف لائے۔ کہنے لگے کہ وہ عیسائی اس لئے ہوئے ہیں کہ قیامت

کی گھڑی قریب آ رہی ہے۔ باتوں باتوں میں ذکر پرویز صاحب کا آ گیا ـــ اور آج کل کون سی ایسی محفل ہے جس میں مذہب پر گفتگو ہو اور پرویز صاحب کا ذکر اس میں نہ آئے ـــ "دیکھئے! میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں" ـــ مشنری صاحب نے فرمایا۔ یہ کہہ کر انہوں نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے طلوع اسلام کا اکتوبر ۱۹۶۲ء کا شمارہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ "جب خدا کا آخری پیغام نوع انسان تک پہنچا دیا گیا ہے تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ـــ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر ـــ" مجھے اس کے ان الفاظ سے صدمہ سا ہوا ـــ صدمہ اس بات سے کہ وہ (بقول اس کے) ایک بشارتیں دینے والے مذہب کا مبلغ ہے لیکن ذہنیت کس قدر متقیانہ ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ ہم سابقہ انسانی نسلوں کے مقابلہ میں خوش قسمت ہیں، بہت زیادہ خوش قسمت۔ کہ ہم خدا کے آخری، غیر متبدل اور مکمل پیغام کے وارث ہیں۔ ہمارے مذاکرہ کا موضوع اس دعویٰ کی تردید نہیں۔ اس پیغام کی محکم بنیادوں پر ایک حسین و جمیل عمارت کو استوار کرنے کا عزم ہے۔ خدا کا آخری پیغام، انسانی فکر کے راستے بند نہیں کرتا۔ وہ روشنی کے بلند مینار کی طرح، فکرِ انسانی کی راہ نمائی ساحلِ مراد کی طرف کرتا ہے، اور مرادوں کا ساحل ایک ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی میں نت نئی مرادیں سامنے آتی ہیں اور ان کے لئے نت نئے ساحلوں کی تلاش جاری رہتی ہے۔

وہ مشنری صاحب تو تشریف لے گئے لیکن میرے لئے غور و فکر کا سامان چھوڑ گئے۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس سے میرے دل میں تین سوال ابھرے۔ پہلا سوال یہ کہ جسے ہم "خدا کا آخری پیغام" کہتے ہیں، اس سے مراد کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس پیغام کا علمبردار کون ہے۔ اور تیسرے یہ کہ "نیا زمانہ اور نئی صبح و شام" سے مقصود کیا ہے۔ آیئے ہم ان سوالات پر ایک ایک کر کے غور کریں۔

ظہورِ اسلام سے پہلے جب وحی کی روشنی اپنی اصل شکل میں دنیا میں کہیں نہیں رہی تھی، انسان حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ بالعموم جاہل بھی تھا، کمینہ بھی اور مکار بھی۔ وہ موروثی بادشاہت کو بہترین نظامِ اجتماعیہ قرار دیتا تھا۔ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا غلام بناتا تھا۔ لیکن خود توہم پرستیوں کا غلام بنتا تھا۔ مشرق میں، وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتا تھا اور مغرب میں وہ اپنی عورتوں کو جادوگرنیاں قرار دے کر زندہ جلا دیتا تھا۔ مختصر الفاظ میں، اس کی ذہنی صلاحیتیں پست ترین سطح پر تھیں اور اس کے زاویۂ نگاہ میں انسانیت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کی راہ نمائی کے لئے خدا کی طرف سے بہت سے پیغامبر آتے رہے لیکن وہ اپنی جہالت اور حماقت کی بنا پر ہمیشہ خدائے کائنات کو چھوڑ کر، گوسالۂ سامری کے سامنے سجدہ ریز ہوتا رہا ـــ لیکن انسان کی ان حماقتوں کے باوجود، آسمانی راہ نمائی اپنے اثرات مرتب کرتی رہی۔ کاروانِ انسانیت سست رفتار تو ضرور رہا لیکن اس کا قدم بہرحال آگے کی طرف اٹھتا رہا۔ جہالت کی تاریکیاں اس کا راستہ روکتی رہیں۔ لیکن یہاں وہاں، قندیلِ آسمانی کی کرنیں [illegible]

دکھائی رہیں۔ یوں انسانی بچہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا گیا۔ جب یہ اپنے عہدِ شباب تک پہنچ گیا۔ تو اسے قدم قدم پر کسی انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہ رہی۔ اس کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ زندگی کے ہر دوراہے پر ایک سائن پوسٹ نصب کر دیا جائے جو جلی حروف میں بتائے کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے سفرِ حیات طے کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اسی کو خدا کا آخری پیغام کہتے ہیں۔

ہمارا دوسرا سوال یہ تھا کہ خدا کے اس پیغام کا پیغام بر کون تھا؟ کیا وہ تاریخ کی ایک جیتی جاگتی شخصیت ہے یا محض افسانوی دنیا کی تخلیق؟ اگر وہ ایک حقیقی شخصیت تھی تو اس کی سیرت و کردار کیسے تھے اور اعمال و افعال کس قسم کے؟ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ پیغامبر، تاریخ کی ایک حقیقی شخصیت تھی جس کے صادق اور امین ہونے کی شہادت اس کے دوست ہی نہیں، دشمن تک بھی دیتے تھے ـــــ ایسی تاریخی شخصیت کہ اس کے یومِ پیدائش سے لے کر دمِ واپسیں تک اس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک واقعہ زمانے کی ریگِ رواں پر تابندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہا ہے ـــــ اس کی پاکیزہ زندگی کا ریکارڈ بھی ہمارے پاس موجود ہے اور اس کا لایا ہوا پیغام بھی، اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں محفوظ۔ ہماری یہ وہ منفرد خصوصیت ہے جس کی حریف دنیا کی کوئی قوم نہیں ہو سکتی۔ اور ہم اس پر جس قدر بھی فخر کریں، کم ہے۔

اب آیئے تیسرے سوال کی طرف کہ ـــــ نیا زمانہ نئے صبح و شام سے مقصود کیا ہے ـــــ اس کے جواب کے لئے ہمیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ایک مردِ راہ داں نے ـــــ جسے ہم محبت اور عقیدت سے قائدِ اعظم کہہ کر پکارتے ہیں ـــــ نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کا عزم کیا۔ اور اس طرح اس نے تاریخِ انسانیت میں ایک نئے عہد کا اضافہ کر دیا جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔

پھر ایک ستمبر کی صبح ہم نے ـــــ ہاں میرے عزیز محبِ وطن بھائیو! ہم نے ـــــ ایک اور نیا زمانہ تخلیق کیا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہ زمانہ، اور یہ صبح و شام، ایسے نئے، ایسے درخشندہ و تابناک تھے کہ ان سے اُن منافقین کی آنکھیں چندھیا گئیں جو ہمارے دوست بنے پھرتے تھے۔ ہماری قوم کے عہد آفریں جیالوں نے دشمن کو وہ سبق دیا جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس سے ہمیں امن کی زندگی نصیب ہوئی ـــــ ہماری داخلی دنیا میں بھی امن، اور خارجی دنیا میں بھی امن ـــــ امن، اور ہر مرد و زن، اور بوڑھے اور بچے کے لئے امن ـــــ

لیکن ستمبر ۱۹۶۵ء کی عہد آفریں کہانی میں ہم ایسے نہ کھو جائیں کہ اس کا حقیقی مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ تحریکِ پاکستان سے مقصد ایک ایسے خطۂ زمین کا حصول تھا جس میں ہم اسلامی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں، اور ستمبر کی جنگ اس خطۂ زمین کی حفاظت کے لئے جہاد تھی۔ لہٰذا، نہ تو تشکیلِ پاکستان ہمارے لئے مقصود بالذات تھی نہ ستمبر کی جنگ مقصود بالذات۔ یہ دونوں ذریعے تھے اس نظام کے قیام کا جو خدا

سکے اس آخری پیغام کے مطابق استوار کرنا تھا جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مہدِ آفرینی کو کوئی جدت قرار نہیں دیا بلکہ اسی سلسلۂ زریں کی ایک کڑی کہا ہے جس کا آغاز آج سے چودہ سو سال پہلے سرزمینِ حجاز سے ہوا تھا۔

خواتین و حضرات! میں نے جو کچھ اس وقت تک کہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے مختصر الفاظ میں دہرا دوں۔ دانشوروں نے ہمیں بتایا ہے کہ

زندگی ایک مثبت حقیقت ہے اور اس کا انجام قبر نہیں۔

لیکن زندگی کی یہ مثبت حقیقت، پہلے دن سے، مکمل شکل میں سامنے نہیں آگئی تھی۔ یہ زمانے کے ہزارہا نشیب و فراز میں سے گزرتی، ارتقائی منازل طے کرتی، آگے بڑھتی چلی آرہی ہے۔ اس سفرِ ارتقاء میں جب یہ اس مقام پر پہنچی جہاں انسانیت بالغ ہو گئی تو خدا کی طرف سے اس کی راہنمائی کے لئے کچھ ابدی اور غیر متبدل مستقل اقدار دی گئیں اور اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ، ان مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، زندگی کے مسائل کا عملی حل خود دریافت کرے۔ اس سے واضح ہے کہ خدا کے آخری اور مکمل پیغام کا نتیجہ یہ نہیں۔ (جیسا کہ اس مشرق نے غلطی سے سمجھ لیا تھا) کہ اس سے انسانی فکر و عمل کی راہیں مسدود ہو گئیں ہیں۔ اس نے تو بلکہ انسان کے سامنے ان راہوں کو کشادہ کر دیا ہے جن پر چلنا تو ایک طرف ان کے تصور تک سے انسان خائف تھا۔ اس نے انسان پر چند اصولی اخلاقی پابندیاں عاید کر کے اسے ہر نوع غلامی سے آزاد کر دیا ہے ـــــ ملوکیت کی غلامی ـــ مذہبی پیشوائیت کی غلامی ـــــ نظامِ سرمایہ داری کی غلامی ـــــ کائنات کے عالمگیر افق پر ـــ نیا زمانہ اور نئے صبح و شام ـــ پیدا کرنے والے داعیٔ انقلاب حضور رسالتمآب نے اپنے بے پناہ عمل سے، غلامی کی تمام زنجیروں کو توڑ کر انسان کو حقیقی آزادی سے روشناس کرایا۔ اس نے زندگی کو ایک نیا خواب، اور اس خواب کو ایک نئی تعبیر عطا کی۔ اس نے اس طرح، تاریخِ انسانیت میں ایک جدید اور زریں باب کا اضافہ کر دیا۔ لیکن اس کے بعد انسان پھر اپنی سابقہ جہالت اور حماقت کی زندگی کی طرف پلٹ گیا۔ چنانچہ آج وہ پھر ان زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہے جنہیں اس مہد آفرین داعیٔ انقلاب نے، پیغامِ خداوندی کی ضربِ کلیمی سے ایک ایک کر کے توڑا تھا۔ آج پھر ایک انسان دوسرے انسان کا محکوم بنتا ہے ـــ خواہ اس محکومی کو مصنوعی آزادی کے کتنے ہی نظر فریب نقاب کیوں نہ اوڑھا دیئے جائیں ـــ آج پھر ایک فرد دوسرے کا محتاج ہے ـــ روٹی تک کے لئے محتاج ـــــ آج پھر خدا اور بندے کے درمیان انسان، حاجب و دربان بن کر کھڑے ہیں۔ آج پھر عورت اسی طرح زندہ درگور کی جا رہی اور معاشرہ کی باطل اقدار کی چتا میں جلائی جا رہی ہے۔ آج پھر ہر طاقتور قوم کمزور اقوام کے ما حصل کو لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہے۔ آج پھر انسان کا خون پانی کی طرح ارزاں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ـــ آج پھر ضرورت ہے ـــ اور شدت کے ساتھ ضرورت ہے کہ افقِ عالم

پر پھر وہی نیا زمانہ اور نئے صبح و شام نمودار کئے جائیں جو چودہ سو سال پہلے وجۂ تابانی عالم بنے تھے اور جنہیں دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھیں ترس رہی ہیں ——— ظاہر ہے کہ اس نئے زمانے اور نئے صبح و شام کی نمود اُس اور صرف اُس قوم کے نوجوانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہو سکتی ہے جو خدا کے اس آخری پیغام کی امین ہے ——— یعنی ملت پاکستانیہ کی نژادِ نو کے ہاتھوں ——— اس میں شبہ نہیں کہ یہ راستہ بڑا کٹھن ہے اور اس کے لئے بڑی قربانیوں کی ضرورت. لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ اس قاعدۂ آسمان کو کوئی نہیں بدل سکتا.

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

لیکن اس "خون" سے مراد ملک میں فساد برپا کرنا نہیں ——— پاکستان کے استحکام و سالمیت کے لئے، دشمن کا مقابلہ کرنے میں قربانیاں دینا مراد ہے اور میں قوم کو یقین دلاتی ہوں کہ پاکستان کی نژادِ نو جس کا

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ان قربانیوں کے لئے ہر وقت تیار ہے ۔ والسلام!

——— (۵) ———

سلیم اختر ...

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

ملتِ اسلامیہ اپنی شبِ قدر سے گزر رہی ہے

جو قوم خونِ شہادت کی شفق میں ڈوب کر نکلی ہو اس کا رنگ کیا ہوتا ہے؟ یہ بعد میں دیکھ لیں گے. اس وقت عالمی منظر یہ ہے کہ انسانیت کا دیدۂ تر بے خواب ہے. ایسی بے بسی بے خوابی اور ایسے لاچار شعور سے تاریخ آج تک دوچار نہیں ہوئی. اور تاریخ کبھی تک دوچار نہیں ہوئی ایسے سفر سے بھی جس میں وہ رواں دواں بھی ہو اور ساکت و جامد بھی. کسی قوم کی شبِ انقلاب اس کے تیس ہزار چمکتے "دمکتے" خورشیدوں سے افضل و برتر ہوتی ہے[1] رات بھر مستقبل کے پیمانے بنتے ہیں نئے سانچے تیار ہوتے ہیں اور بالآخر روحِ انقلاب ان میں قرار پکڑ لیتی ہے

---

[1] "قرآنی ضابطۂ حیات کو ہم نے شب قدر میں نازل کیا. بھلا شب قدر کیا ہے؟ یہ پیمانوں بھری رات ہزار مہینوں (۳۰ ہزار) سے بہتر ہے اس میں بحکم خداوندی آفاقی و روحانی مظاہر قوت ہر گوشۂ حیات میں امن و سلامتی کے حامل بن کر آتے ہیں. حتیٰ کہ نورِ سحر نمودار ہو جاتا ہے." (سورۃ قدر)

(حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ)۔ یہ رات بڑی پُرمشقت اور پُرسوز ہوتی ہے۔ جو قوم اس میں چاق و چوبند اور تمام و کمربستہ رہی، انفس و آفاق کی امنڈتی ہوئی قوتیں اس کے بازوؤں میں آ رہیں اور طلوعِ سحر سے اس کا پیمانِ وفا بندھ گیا۔ قومی زندگی کے عروج و زوال کو مؤرخ کم و بیش ایک سو سال میں محصور کرتا ہے۔ اور پھر اس کو دو ادوار۔ شمشیر و سنان اول اور طاؤس و رباب آخر۔ میں تقسیم کر دیتا ہے۔ قرآن نے اس کی تقسیم تین ادوار میں کی ہے جس قوم کی ترکیب میں احیاءِ مسلسل کا خمیر ہو، وہ زوال آشنا تو بے شک ہوتی ہے مگر زندگی کے جرثومے سے محروم نہیں ہوتی۔ اسی جرثومے کی تربیتِ نو اور احیاءِ مکرر اس کا تیسرا دور ہے جو طاؤس و رباب کی خاک سے جنم لیتا ہے۔ اسے پلٹنے جھپٹنے کا دور کہتے ہیں، اسی کو شبِ انقلاب کہتے ہیں۔ یہی "لیلۃ القدر" (شبِ قدر) ہے۔ یہ ہوتی رات ہی ہے مگر صبح کا ستارہ اسی کی تیرگی میں پرورش پاتا ہے۔ یہ ایک صدی کا خمس آخر ہے جس کا سجود و قیام عروج و زوال پر مشتمل گذشتہ چار خمسوں یعنی "ایک ہزار مہینوں" کے سجود و قیام سے "برتر" ہے۔ عظیم ترین شبِ قدر جس میں حیاتِ انسانی کے ازلی و ابدی پیمانوں اور قدروں کا نزول ہوا اور روحانی و آفاقی مظاہرِ قوت ہر گوشۂ حیات میں امن و سلامتی کے پیامبر بن کر آئے وہ دورِ نبوت ہے جو (ایک صدی کے خمس) ۲۳ برس پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پوری انسانیت کی شبِ قدر تھی، جب زندگی کے پرانے پیمانے چھلک پڑے تھے۔ جب بھی زندگی کے پرانے پیمانے چھلک پڑیں، تو شبِ قدر آتی ہے۔

آج انسانیت کا دیدۂ تر بے خواب ہے۔ ایسی بے بس بے خوابی اور ایسے لاچار شعور سے تاریخ آج تک دوچار نہیں ہوئی۔ اور، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، تاریخ آج تک دوچار نہیں ہوئی ایسے سفر سے بھی جس میں وہ رواں دواں بھی ہو اور ساکت و جامد بھی۔ ملتِ اسلامیہ اپنی شبِ قدر سے گذر رہی ہے اور پورا دور اس شبِ قدر کے روبرو ہے۔ زندگی کی بے آئینی نے اور اخلاقی ظروف کی تنگی و بے بسی نے کائناتِ انسانی کو دکھ، درد اور گہری جراحتوں سے بھر دیا ہے۔ بے شک اقوامِ عالم صدیوں سے اپنی اپنی شبِ انقلاب کو سحر کر رہی ہیں اور مسلسل تگ و دو میں اپنی جانیں کھپا رہی ہیں۔ مگر ہر سحر جب جوان ہوتی ہے تو خود اس کے خالق چیخ اٹھتے ہیں کہ یہ تو بجھا بجھا اُجالا اور دھندلائی ہوئی روشنی ہے۔ اس کا سبب قوموں کی نگاہوں کی کوتاہی اور عملِ سحر خیزی میں عرصۂ تنویر کی تحدید ہے۔ اور یہی انسانیت کی قوت کا دروازہ ہے۔ کوئی قوم یا کوئی عالمی برادری اس وقت تک کامیاب اور قابلِ تعمیلِ آئینِ حیات پیش نہیں کر سکتی جب تک وہ اپنے قومی و گروہی مفاد اور اقتدار کی جھونپڑی سے باہر نکل کر انسانی مفاد اور انسانی اقتدار کی سطحِ مرتفع پر کھڑے ہونے کا دل گردہ پیدا نہیں کر لیتی، اور اس دل گردے کا خون، اعلیٰ غذا اور صحت افزا آب و ہوا سے نہیں بنتا، نہ آئین و دستاتین کی نئی پرانی کتابوں کا خون چوس کر اس دل گردے میں رواں کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو اس سرچشمے سے اُبلتا ہے جو نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں۔ اس سے چُلّو بھرنے ہی پڑتے ہیں۔ اور دامن

اس میں تر کرنا ہی پڑتا ہے۔ تاریخ بلاخوفِ تردید پکار رہی ہے کہ وہ سرچشمہ انسانی ذہن و عقل اور تجربہ و سچ کے جواہر کا ذخیرہ نہیں بلکہ وہ تو وہ نورِ نظر اور وہ نورِ ایمان ہے جو عقل و ذہن کے بحرِ ظلمات میں اچانک کہیں سے اتر پڑتا ہے۔ اور بے کھٹکا اس میں بہنے لگتا ہے۔ اسی نور کو ہم "مطلق اقتدار" کہتے ہیں، مستقل اقدار، ناقابلِ شکست اقدار، غیر مشروط اقدار، تسلیمِ جاں کی متقاضی اقدار، سرخ و پاک خون کی متقاضی اقدار۔ یہ اقدار فرد یا قوم کے ذہن یا ضمیر سے نہیں ابھرتیں۔ فرد اور قوم کا ذہن اور ضمیر تو محدود و نیز منفرد ہوتا ہے اور ذہن کوتاہ خود بین اور بہبود غیر سے غافل بھی۔ یہ تو اس محیطِ بے کراں سے حاصل ہوتی ہیں جس میں زندگی کا پیمانہ ڈبو کر کوئی بھی بھر لا سکتا ہے اور بزمِ انسانیت کو چراغاں کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔

عصری تقاضوں نے ہمیں ایک عالمی برادری بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ قوموں نے از راہِ انسانیت نہیں، بربنائے مجبوری اس ادارے کی بنیاد ٹوٹے پھوٹے ہاتھوں سے رکھی ہے۔ ہر ہاتھ میں اپنے مفاد کا ہاتھ کارفرما ہے اور انسانیت کا محل ٹوٹے ہاتھوں سے، خود غرضی کے مٹی گارے سے اور خبثِ باطن کی ظلمتوں میں تعمیر نہیں ہوتا، اس کے لئے تو محبت کے سمندر میں دھلے ہوئے اُجلے اور گداز ہاتھ، زندہ و پاک خون کا مٹی گارا، اور زمین و آسمان کی وسعتوں کو شرما دینے والے فراخ سینوں کی روشنی درکار ہے۔ اداس کیمیا کا ظہور "مطلق قدروں" کے بطن سے ہوتا ہے۔ جس ملت کے پاس مطلق قدریں موجود ہیں وہ اپنی شبِ قدر میں مزاحمتوں سے برسرِ پیکار ہے۔ اس کی سحر سے انسانیت کی شبِ تار بھی گریزاں ہوگی۔ یہ قطعی اور دو ٹوک انجام ہے اس دور کا۔ کیونکہ دنیا کی ہر قوم تہی دامن ہے ان مطلق قدروں کی دولت سے جن کی مانگ سے آج ایک عالم گونج رہا ہے۔ اس وقت شاید کوئی بھی قوم ان سلیم الفکر افراد سے خالی نہیں جو قومی اور عالمی آئینِ حیات کی دریافت کے لئے برسرِ جہاد ہیں۔ دنیا کا ہر سلیم الفکر اور حسین باطن فرد، دم توڑتی زندگی کے خشک لب، اقدارِ مطلق کی خنک سطح پر لگا دینے کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے اور یہی اب آخری چارہ کار بھی ہے۔ کیونکہ زندگی ایک بحرِ پُرشور و بے کراں ہے، ذرا سی عقلِ انسانی کے ساختہ آئین و قوانین اسے بند نہیں باندھ سکتے۔ جذبے کو عقل کبھی کنٹرول نہیں کر سکتی۔ جذبہ ہی جذبہ کو زنجیر پا کرتا ہے۔ اقدارِ مطلق ہمیں اپنے جذباتی سرچشمہ اور الوہی روشنی سے بالراست ملی ہیں اور والہانہ ہمارے سینوں میں اتر گئی ہیں۔ زندگی کے طوفان کو وہی تھام سکتی ہیں، اس کی شورشوں کو وہی راہ پر ڈال سکتی ہیں۔ جذبہ عقل کی تنقید و مداخلت سے بپھرتا اور گھبراتا ہے مگر جذبہ، جذبے کی بارگاہ میں سر جھکا دیتا ہے

اب آپ بیتی کی طرف آیئے! "ملت اسلامیہ اپنی شبِ قدر سے گذر رہی ہے"۔ اپنی شبِ انقلاب سے گزر رہی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ رات بڑی پُرپیچ اور اس کا ہر پیچ بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس کا ہر لمحہ ایک الگ شان سے نمودار ہوتا ہے اور اپنا کچھ الگ ہی رنگ ڈھنگ رکھتا ہے۔ مگر تمام لمحات ایک مقصد کی کشش میں جکڑے

ہوتے اور ایک ہی پس منظر کی بساط پر ٹکے ہوتے ہیں۔ پس منظر کے قیام کی ضمانت تاریخ دیتی ہے اور لمحاتِ انقلاب کی رنگ برنگ لڑی کو مقصد کی طرف کھینچی جاتی ہے، رہنا و بینا، مدبر الامور قیادت بڑھاتی ہے۔ اس قیادت کا اساسی کام سمتِ مقصد کا صحیح تعین اور پس منظر کے کناروں کی حفاظت ہے۔ اس گمبھیر رات کا قائد بڑا گمبھیر ہونا چاہیئے۔ ملتِ اسلامیہ کے پس منظر میں اس کی اقدارِ مطلق کا چوکھٹا ہے۔ وہاں سفر وہ اس سے سُوت بھر باہر نکلنے کی مجاز نہیں۔ اقدارِ مطلق جب ایک گروہِ انسانی کی اقدارِ مشترک بن جاتی ہیں تو اس گروہ میں شامل ہونے والا ہر فرد اور ہر جماعت ان قدروں کی پرستش کرتی ہے، عزت کرتی ہے، ان کی بقا کے لئے جان مال اور ثمراتِ حیات تک کی قربانی دے دیتی ہے۔ مگر انہیں پھاند کر بے آبرو کرنا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اس پس منظر میں انسانی و قومی کردار کی تخلیق و تربیت ہوتی ہے۔ یہی انسانوں میں باہمی اعتماد کی کلید ہے، یہی اخوت و محبت کا دروازہ ہے اور یہی انسانیت ساز فضا کا قائم مال۔ اسی ائتلاف و اشتراک کے سہارے اجنبیت کے پردے اٹھتے ہیں۔ رنگ و نسل کی خلیجیں پٹتی ہیں اور دریا و پہاڑ عبور ہو جاتے ہیں۔ پھر امن و سلامتی کا شہر آجاتا ہے اور یہی انسانیت کا شہر ہے، یہی سمت مقصد ہے۔ منزلِ مقصود سے پہلے یہی آخری منزل ہے اور منزلِ مقصود؟ وہ اس کاروان کے خون سے سینچا ہوا وہ جہان ہے جس میں کوئی فردِ بشر اپنی تکمیل اور عروج کی راہ میں کوئی ناقابلِ مزاحمت روڑا نہیں پاتا۔ جہاں ہر پھول پورا کھلتا ہے اور کوئی کلی بند نہیں رہتی۔

اس گمبھیر رات کا قائد بڑا گمبھیر ہونا چاہیئے۔

ملتِ اسلامیہ میں اس رات کا سحر خیز قائد غائب ہے۔ پس منظر بڑا مستحکم ہے، مگر مقصد کی کشش کمزور ہے۔ جو رخِ عمل موجود ہے مگر عمل بامقصد نہیں، عمل بامقصد نہ ہو تو زندگی کے سوتے متحرک نہیں ہوتے اور عمل بے ثمر رہتا ہے۔ دُنیا بھر میں مسلمان قوموں نے اپنے عمل کا مقصد اور ذیلی مقاصد متعین نہیں کئے، سفر کی سمتیں درست نہیں کیں۔ یہ اس رات کی بڑی المیہ منزل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ درست قیادت کا فقدان ہے۔

یہاں اس مسئلہ کا دوسرا رُخ چھپا لینا شایانِ دیانت نہیں۔ اس رُخ کی توضیح یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے باب میں جسے زوال کہا جاتا ہے وہ اس کے ارتقاء کی خاموش اور گمنام کڑیاں ہیں۔ خود ملتِ اسلامیہ اگرچہ اس دور میں ... کفر بھی و نانیہ مشاغل میں ملوث نظر آتی ہے مگر وہ اس کی غفلت کے لئے دلیل نہیں بلکہ اس کی کمسنی کا تقاضا ہے۔ ہر وقت کے بہتے دھارے پر شعاعیں اسی کے پس منظر سے پڑتی ہیں۔ جس قدر بھی مستقل قدریں (نظامِ اسلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ عقلاً و جزئاً) ہر وقت اور ہر تخت نے چھپ چھپ کر چرائی ہیں وہ اسی مقدس و منضبط پس منظر کے متفرق و منتشر اجزاء ہیں اور ملتِ اسلامیہ اس سے بے خبر نہیں۔ اسے ہر دور کے ہر مرحلہ پر یہ علم رہا ہے کہ میرے خزانے کے کتنے اور کون کون سے موتی دوسروں کے تاج میں ٹکے ہیں۔ وہ اپنے پس منظر سے اپنی مطلق اقدار کے

پردے ـــــ سے چھن چھن کر کونے کونے میں پڑنے والی کرن کرن کا شمار کرتی ہے۔ اس کے پاس اس باب میں پورا پورا حساب کتاب موجود ہے ماسے وہ اپنے ارتقائی مراحل کی علامت سمجھتی ہے۔ مطلق قدروں کے جو ازلی و ابدی سانچے انقلاب اسلام نے تیار کر کے دیئے تھے اس کا مشروب (انسانی سن و سال کے مطابق بہت تیز اور تلخ تھا۔ بے شک ایک مخصوص معاشرے نے جو عام انسانی سن و سال سے بہت آگے اور استثنا تھا۔ ان قدروں کو عملاً ـــــ اور تمثیلاً ـــــ متشکل کر کے ان کی تشکیلی و تعمیلی صلاحیتوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی مگر عام انسانی سطح اسے آگے بڑھانے اور استعمال کرنے کے ناقابل تھی اس لئے وہ تمام تر نظام قوانین و اقدار ارتقاء کی سست روی کی نذر ہو گیا۔ اس ارتقاء کے دوران جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے' اس کے لئے ملت اسلامیہ ماخوذ نہیں کیونکہ وہ اس کی غفلت نہیں' تقاضائے سن و سال ہے۔

جہاں تک اس نظریئے کا تعلق "پس منظر" اور اس کے متعلقات سے ہے' اس سے مجھے اعراض نہیں۔ بلکہ مسلمان قومیں اب اس حقیقت کو ذرا کھل کر کہنے لگی ہیں اور آنے والے انقلاب کے مؤرخ کو اسے ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہی بن پڑے گی۔ یہ درست ہے کہ اس کے مشاغل نازیبا اور تفریحات کے دوران اس کا پس منظر بیدار و روشن رہا اور زندگی کے ہر دور پر اسی کی بجلیاں تڑپ تڑپ کر گرتی رہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ملت اسلامیہ میں شب قدر کی قیادت کے فقدان نے جس بے بسی کی کیفیت سے دوچار کر رکھا ہے وہ بے بسی تو یہ پوچھتی ہے کہ یہ تقاضائے سن و سال اور یہ کسمپرسی کہاں جا کر دم لے گی اور انسان کی ذہنی تربیت کی تکمیل کے لئے اب کون سی کٹھالیاں درکار ہیں؟ میں تو کہتی ہوں' وقت کی یہ کندن بنانے والی بھٹیاں اور کٹھالیاں' در پردہ بھٹیاں اور کٹھالیاں کم اور انسان کا اپنا سامان عیش و نشاط زیادہ ہے۔ ارتقاء کی آڑ میں دراصل انسان اپنی عمر رنگین میں توسیع کر رہا ہے۔ ارتقاء کی کڑیوں ہی سے اگر امتوں اور ملتوں کے ادوار غفلت کو نکال کر انقلابوں کے رشتے انقلابوں سے معیاری وقفوں کے بعد جڑ جاتے تو کیا حرج تھا۔ اگر روسو اور لاک ، معاویہؓ کے "ایک ہزار مہینوں" کے بعد اور اسی پس منظر سے ظہور میں آجاتے تو کون سی عیب کی بات تھی۔ اچھا ہی تھا انہیں بھی ایک نکھرا اور دھلا ہوا پس منظر مل جاتا۔ (اور اسی غلطیوں سے محفوظ ہو جاتے)' انسانیت کی مسافت بھی سمٹ جاتی۔ فرانس اور یورپ کی زمین بھی سرخ نہ ہوتی۔ اور پھر ایک ہزار مہینے "گزار کر" پارس ان دونوں کا خلف رشید بن کر آتا تو کون سا حشر برپا ہو جاتا۔ اگر ہو بھی جاتا تو آخر اسے ایک دن برپا ہونا ہی تھا۔ اسی طرح سینکڑوں ذیلی مثالیں بھی۔ مگر یہ تو ہمارے نزدیک ہے' اس انسان کے نزدیک جو موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہے۔ موجوں کے تھپیڑے کھانے والے اور اضطراب نا آشنا کا انداز فکر ایک نہیں ہوتا۔ غافل و ظالم انسان نے اپنے لئے جو بے شمار سادہ و رنگین لباس پسند کر رکھے ہیں اگر زمانہ سکڑ جاتے تو انسان وہ لباس پہن پہن کر کسے دکھلاتے ـــ اگر مناظر حیات کم ہو جائیں تو انسان کی عمر گھٹ جانے کا ذمہ دار کون ہو؟ ـــ اس نے اپنی بہاریں پوری کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور ان بہاروں کا سامان وہ انسان ہی کے خون سے کرتا ہے۔ وہ خون رزمگاہ کے پروانوں کا بھی ہوتا ہے اور تنہا

جلنے والی شمعوں کا بھی۔ یہ ہمارے لئے دعوتِ فکر ہے۔ عام احوال میں یا دورِ غفلت و زوال میں تو اُمتوں کا وقار اور خون ارزاں ہو جاتا ہے مگر شبِ انقلاب اور امتِ مسلمہ کی شبِ انقلاب میں انسان کی یہ ارزانی بڑی شرمناک ہے۔ شبِ انقلاب میں تو قوم یوں پلٹتی جھپٹتی ہے کہ ارتقاء منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آفاقی قوتیں ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر اس کے قدموں میں آ پڑتی ہیں۔ ملتے صدیوں پر سے گذر جاتے ہیں۔ اور امتِ مسلمہ کی یہ شبِ انقلاب تو بالخصوص غیر معمولی ذمہ داری کی متقاضی ہے۔ اس کی سحر کے ڈانڈے تو ہمیں خلافتِ راشدہ کی شام سے ملاتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار سال لمبے آثار و کھنڈرات ہیں جنہیں عبور کر کے ہمیں پیچھے پلٹنا پھر آگے جھپٹنا ہے۔ پیچھے ہٹتے ہوئے ان آثار و کھنڈرات میں پڑے ہوئے موتی بھی چن چن کر محفوظ کرنے ہیں تاکہ آگے بڑھتے ہوئے انہیں زادِ راہ کے طور پر استعمال کر سکیں۔ شاید اسے الفاظ کی سامان کہہ کر ہنس دیا جائے مگر بہت جلد آنے والی تاریخ جو ہمارے سر پر کھڑی ہے' یہی ہے۔ اندازہ کریں خطرے کا کہ اس رات کا قائد غائب ہے۔ اگر ندامت کے لمحات کا جائزہ لینا ہو تو پوری ملت کو چھوڑ کر اس کے مضبوط ترین اور ممتاز ترین عنصر اپنے ہی گھر کی خبر لینا کافی ہے کہ قیادت کے فقدان نے کن کن زریں موڑوں کو آہستہ رَو اور ارتقاء آسا بھٹیوں کی نذر کر دیا۔

کسی قوم کو انقلابی موڑ عبور کروانے کے لئے دو اہم عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک خاطر خواہ قیادت' دوسرے نفسیاتی لمحہ۔ گذشتہ ۲۱ برس میں پاکستانی قوم پر یہ لمحات تین مرتبہ آئے مگر سر بہ سر یوں گزر گئے جیسے سرما کی چاندنیاں بے آبرو ہو کر گذر جاتی ہیں۔ ہماری انقلابی رات کا ——— پاکستان بننے کے بعد ——— پہلا نفسیاتی لمحہ بابائے ملت کی جدائی پر ۱۹۴۸ء میں آیا۔ پوری قوم پر رقت پہلے ہی ۱۹۴۷ء کے خونچکاں سانحے سے طاری تھی۔ جانوں اور عصمتوں کی ارزانی سے گھر گھر سراپا زخم تھا مگر مستقبل کے ایک حسین و مقدس خواب کی تکمیل کی خاطر اپنے ثمراتِ حیات کے خون سے نہانے والے ہنستے رہے۔ رُوحوں کے رشتے اس وقت اپنے پس منظر اور بلند اقدار سے یوں بندھے ہوئے تھے کہ کوئی طاقت ان کے درمیان حائل نہیں تھی۔ تحریکِ پاکستان کے مخالفین خائف و خاموش تھے۔ ان کے لئے اس وقت یہ غنیمت تھا کہ سر چھپانے کے لئے انہیں یہاں جگہ مل گئی۔ اختلاف نامی یہاں کوئی چیز نہیں تھی۔ زخم بر زخموں سے محوِ ائتلاف و اشتراک تھے۔ عین اس انقلابی گھڑی میں سالارِ قافلہ جدا ہو گیا۔ اس آتشِ موزاں نے قوم کا کوئی رہا سہا' چھپا چھپایا بل خم اگر باقی بھی تھا تو جلا کر ختم کر دیا۔ یتیم قوم منتظر کھڑی تھی کہ اشارہ پاتے ہی اپنے مقصد کی سمت بڑھے اور اس گھر کے حصار کے لئے سینہ سپر ہو جائے جس کی قربان گاہ پر اپنی آرامگاہیں بھینٹ دینے والے ابھی تک آسمان تلے سوتے تھے جن کے انتقام میں بہایا گیا خون زمین نے ابھی جذب نہیں کیا تھا' اور لٹی ہوئی عصمتوں کے نالہ و شیون فضا میں ابھی تحلیل نہیں ہوئے تھے۔ منتظر قوم کھڑی رہی' حکمِ سفر مانگتی رہی' قائد قائد پکارتی رہی ——— مگر قائد کہاں تھا۔ بدنصیب قافلہ منتشر ہونا شروع ہوا اور آوارہ ہو گیا جس مقصد کے لئے اس نے وطنیت و قومیت کے عالمگیر مردِ چٹانوں کو سینہ نیا زانہ

زمین پر دے مارا تھا اور اپنے مولد و منشا کے بُت کو ٹھوکر سے اڑا کر بوقتِ مفارقت اس کی خاک کو بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، وہ مقصد دھندلا گیا۔ مقصد کی روشنی سے غذا حاصل کرنے والے سینے اُس دھند سے بھر گئے۔ جب غم ذرا چھٹنے لگا، اور شعور اُبھرنے لگا تو اجتماعیت اور مرکزیت کی جگہ گروہ بندیوں اور انفرادیت نے آنکھیں کھولیں۔ زندگی کبھی رُکتی نہیں۔ نقطۂ ارتکاز اجتماعی نہ ہو تو زندگی بے لگام انفرادیت اور تفرقہ پسندی کی راہ اختیار کر لیتی ہے جس میں مختلف بولیاں اور پیچھے رہتے ہیں معانی و مطالب نہیں ہوتے۔ پھر پاکستان میں جتنے کروڑ زبانیں تھیں اتنے کروڑ مسائل پیدا ہو گئے بلکہ یُوں بڑھ کر جوان ہو گئے حتیٰ کہ لامرکزیت اور نفسی نفسی سے پاکستانی تو بعد کی بات رہی، خود سرزمین پاکستان ہی خطرے میں پڑ گئی۔ اس ڈوبتی ناؤ کو ۲۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کے عسکری انقلاب نے سہارا دیا۔ یہ چشم زدن میں ہوا۔ عسکری حکومت کو علاقائی تعصب، لسانی تعصب، مسئلہ کشمیر اور کشمیریوں کا راست اقدام، خارجی معاہدوں کے گلے پڑے ڈھول، خالی خزانہ، ۱۹۵۶ء کا آئین اور سیاستدان بطور تحفہ ملے۔ یہ تحائف اسے پیشرو نام نہاد اربابِ حکومت سے ملے تھے، قوم سے نہیں۔ قوم کی تو اس انقلاب سے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ گو دس برس یہ خوب کھل کھیلی تھی مگر کچھ کھینچے کی دبی دبی خلش اس کے شعور کی تہوں میں موجود تھی۔ فیلڈ مارشل ایوب خان نے اس انداز اور ان الفاظ میں اپنا خطبہ استقبالیہ قوم کے سامنے پیش کیا کہ اسکا تحت الشعور دس برس کی مسافت آن کی آن میں طے کر گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے قومی شعور کے رشتے پھر اس کے پس منظر سے اور روحانی اقدار سے بندھ گئے۔ اب سینوں میں وہی طوفان امڈ آیا جو کبھی —— تحریکِ پاکستان کے دوران اور ۱۹۴۶ء و ۱۹۴۷ء میں —— برپا ہوا تھا۔ اس مرتبہ گذشتہ دس سالہ متعفن دباؤ سے پیدا ہونے والے ردِعمل کا بھی اس میں حصہ تھا۔ بعض اہم اور منفرد تاریخی اسباب و محرکات کی وجہ سے شبِ انقلاب کا یہ نفسیاتی لمحہ خاصا طویل تھا —— بلکہ —— غیر معمولی طور پر طویل۔ اتنی طویل نفسیاتی گھڑی کی نظیر تاریخِ اقوام میں شاید مفقود ہوگی۔ مگر یہ بھی گزر گئی بہت بے آبرو ہو کر۔

آئین آیا تو صحنِ چمن میں سینکڑوں بولیاں اور چہچہے گونجنے لگے۔ اور یہ "ممکن" قوم ان میں بہل گئی۔ "زندگی رُکتی نہیں" اسے تو ایک راہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بھی اسے اپنی راہ پر ڈال لینے میں کامیاب ہو جائے، وہی کامیاب ہے خواہ وہ تخریب کار ہو۔ نام نہاد سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے قوم کو باور کرا دیا کہ ہم اصلاحِ آئین کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کسی فکر کی ضرورت نہیں۔ قوم اپنے معمولات میں مشغول ہو گئی۔ اضطرار و اضطراب سکون پذیر ہو گیا۔ اور چڑھتا ہوا دریا ارتقاء کا مسکین رفیقِ راہ بن گیا۔ قوم نے چھٹی پائی۔

مگر زندگی کا اندرونی حال آجکل کچھ اس طرح ہے کہ پرانے پیمانے ہر سانس کے ساتھ چھلک چھلک جاتے ہیں۔ ان ظروف میں تقاضائے حیات کی مے سما نہیں رہی۔ انقلابی روئیں زندگی کے سینے میں برق آسا دوڑ رہی ہیں۔ وہ اس سینے کو چیر کر اپنی نمود کے لئے بے تاب اور آغوشِ سحاب سے چھٹنے ... کے لئے بار بار سر اٹھاتی ہیں۔ آہنی دور کی چار

ہی خزائیں گزری تھیں کہ بہار اچانک کہیں سے ٹوٹ پڑی۔ اب مرتبہ تمہ حیات ایک نئی راہ سے اٹھی تھی۔ یہ ہماری انقلابی تاریخ کا ایک عظیم الشان منور لمحہ تھا۔ یہ ستمبر کی گھڑی تھی۔ اس مرتبہ خود زندگی نے اپنا خطبہ استقبالیہ قوم کے پیش کیا جس میں وقت کے چیلنج کا انتباہ تھا۔ سوزِ ایمانی میں کروٹیں لینے والی قوم سینہ سپر ہو گئی۔ قوم کا ہر فرد آتشِ ایمان کا مکمل پیکر اور منظر دید نی تھا۔ منوں خون دیا گیا، ٹنوں خون بہایا گیا۔ یہ ایک عالمی منظر تھا، عالمی سٹیج تھا، عالمی درس تھا۔ عالمی مروجہ معیاروں اور پیمانوں کے ٹکڑے پاکستانی بچے بچے کے ہاتھ میں تھے ــــ امت مسلمہ ایک مشترک سطح مرتفع پر کھڑی تھی ــــ بزعم خود عالمی راہ نما انگشت بدنداں ندامت و خجالت سے زمین میں گڑ گئے۔ زندگی کے حقائق ــــ سیاہ اور سنہری حقائق ــــ ہر عالمی شاہراہ اور پگڈنڈی پر بے حجاب بکھرے پڑے تھے اور ہر عالم و جاہل اور تجربہ کار و نو آموز کے لئے یکساں دعوتِ انقلاب تھے، دعوتِ حیات تھے، دعوتِ اقدام و عمل تھے۔ ملتِ اسلامیہ کی شبِ قدر کی ــــ اس پیمانہ شکن اور پیمانہ ساز شب کی ــــ کھلی تنویر کا ساری دنیا نے ایک ہی زاویہ سے حیرتناک نظارہ کیا۔ پاکستانی قوم جوئے حیات سے بے خود تھی اسے عناں گیری کی ضرورت تھی۔ امتِ مسلمہ کی شبِ قدر کا یہ بڑا حسین اور گراں بہا مختصر سا نفسیاتی لمحہ تھا مگر اپنی تابیں اڑا کر اس مرتبہ بھی بے آبرو گذر گیا۔

زندگی کی جوئے رواں کو ٹھوکر لگا کر اس کی رفتار تیز کر دینے والے عوامل بہت سے ہوتے ہیں مگر شبِ قدر میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ اس جوئے رواں کا رُخ ہی موڑ دیتے ہیں اور تقاضائے وقت اور اکناف و حوالی کو اپنے ساتھ مطابقت کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ فوری پیدا ہونے والا عامل آئینِ قرآن اور روحِ عمرؓ کا حامل ہو گا جو صداقت کو تسلیم بھی کروائے گا اور اس کی تشکیل بھی کرے گا اور اس رات کا سحر خیز قائد ہو گا۔ لیکن ہمارے سامنے اچانک شہید آ گیا۔ زمانے کا رُخ موڑ کر اسے اپنی طرف پھیر لینے والے عاملوں میں شہید سب سے نمایاں عامل ہے۔ مگر شہید قائد نہیں ہوتا۔ وہ تو طاقت کے مروجہ پیمانوں کو توڑ کر اس کی جھنکار سے زمانے کو بیدار کرتا ہے اور نئے پیمانوں کی ساخت کے لئے اپنا گوشت اور خون خام مال کے طور پر مہیا کرتا ہے۔ شہید صداقت کو تسلیم کرواتا ہے، صداقت کی تشکیل نہیں کرتا۔ صداقت کی تشکیل شہید کے بعد آنے والی قیادت کرتی ہے۔ شہید سحر خیزی کے پہلے مرحلے میں اس قیادت کا ہاتھ بٹاتا ہے، زمانے سے صداقت کی طاقت کو تسلیم کروا کر اور اپنوں کے دلوں کے تار چھیڑ کر۔

شہدائے ستمبر کے سوزِ عشق نے قوم کے دل کے تاروں کو براہِ راست چھیڑا تھا۔ ہمارے سوادِ اعظم ہی میں سے ایک گروہ نے ــــ عسکری گروہ نے ــــ سوادِ اعظم کے جذبات آسودہ کئے۔ کوئی قیادت اس میں راہ نما یا محرک نہیں تھی۔ قیادت جس نوع کی تھی اس نے اپنی جگہ اس نوع کا ہر عظیم الشان فرض عظیم الشان انداز سے بے شک ادا کیا مگر یقین و ایمان کی مشعلیں اور عشق و مستی کے اُبلتے ہوئے چشمے اپنے سرچشمے کے براہِ راست مرہونِ منت تھے۔ ہر قومی شعبے کے ہر فرد نے اور ہر صاحبِ اقتدار نے اس بزم میں شرکت کی لیکن کوئی فرد دعویٰ نہیں کر سکتا کہ بزم اس نے جمائی یا وہ

رنگِ محفل کا محرک یا رنگ ساز تھا۔ یہ قوم کے شعور میں دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جو اپنی خاکستر کے ہٹتے ہی چیخ پڑیں۔ اور اس کا اپنا رنگ جگر تھا جو رنگِ خونِ شہداء سے مل کر قوسِ قزح بن گیا۔ بے شک قوسِ قزح بنے پایاں ہوتی ہے۔ اور نظارہ خیز بھی۔ مگر وہ بہنے کے لئے تو نہیں ہوتی، سو چھپ گئی۔ اس کیف و رنگ کو کوئی ٹھوس حقیقت سے آمیز کرنیوالا ہوتا تو وہی وقت کا نفاذ اور آئینِ قرآن اور روحِ عمرؓ کا حامل ہوتا۔ مگر وہ کہاں تھا۔ یہ لطیف سا نفسیاتی لمحہ ــــ چشم زدن میں نکل گیا۔

• تین سال سے ہر دردمند دل رہ رہ کر روتا ہے، وہ دن کہاں گئے، وہ فضا کیا ہوئی، محبت کی وہ رو کدھر نکل گئی، ہمدردی کا وہ نشیمن کیسے کھو گیا۔ مگر کہیں سے یہ آواز نہیں آتی کہ اس بے خودی کے پس منظر کا رشتہ مقصد سے باندھنے والا کوئی نہیں تھا اس لئے وہ قافلۂ شوق لٹ گیا۔

کھیم کرن کے ایک سپاہی کے نام ایک خط میں میں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۶۵ء کو لکھا تھا "...... اگر مستقبل قریب کے اس امتحان میں ہم نے آپ لوگوں کے اس مقدس خون کی لاج نہ رکھی تو جہنم بھی ہمیں قبول نہیں کرے گی۔ آثار کچھ اچھے نہیں۔ یہ میری قنوطیت نہیں بڑی سچی بات ہے۔ قوم سنبھلی ضرور ہے مگر سنبھلی نہیں رہے گی۔ ہنگامہ ٹل گیا تو کوئی یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرے گا کہ یہ زمین سُرخ کیوں ہوئی تھی اور قدرت کا اس سے منشا کیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ۱۹۴۷ء کے بعد ہم ۱۸ برس بھولے رہے کہ ہماری زمین لالہ زار کیوں بنی تھی۔ بس ایک ہی صورت ہے ہمارے بدلنے کی کہ خدا ہم پر رحم کرے اور اس صورتِ حال کو طویل تر کرے، خون اور ارزاں ہو جائے اور اس دہشت سے ہم اپنے نفوس تبدیل کر لیں۔ اس نے اسلام کو اگر زندہ رکھنا ہے تو آپ لکھ لیں خونِ مسلم ارزاں ہو کر رہے گا۔ ہماری استعداد تغیر و انقلاب کھوئی گئی ہے اور ہم اپنی گرفت سے باہر ہیں۔ خدا نے ہماری گرفت کر لی تو اسلام زندہ رہ جائے گا ورنہ کبھی نہیں۔ کم ہی لوگ میرے اس اندازِ فکر کی تائید کریں گے۔ مگر خدا شاہد ہے۔ آنے والی تاریخ یہی ہے ......" اس وقت اس مجاہد نے جواب میں بڑی خود اعتمادی سے اس کی تردید کی۔ پھر دس ماہ کے سکوت کے بعد ستمبر میں اچانک اس کا خط آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خط لکھا اس نے شہداء کی سالگرہ منائی ہے اس کا دل بھرا ہوا ہے۔ چند الفاظ پر مشتمل مگر بڑے جذباتی اور حسرت آمیز سیاق و سباق کے درمیان اس نے لکھا "آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا"

جو قوم خونِ شہادت کی شفق میں ڈوب کر نکلی ہو اس کا رنگ یوں پھیکا پھیکا تو نہیں ہونا۔

اس رات کی یہ بڑی المیہ منزل ہے۔

ملتِ اسلامیہ اپنی شبِ قدر سے گذر رہی ہے اور پورا دورانِ شبِ قدر کے رو برو ہے۔ اس کی سحر سے انسانیت کی شبِ تار بھی گریزاں ہوگی۔ یہ قطعی اور دوٹوک انجام ہے اس دور کا۔

اس گھمبیر رات کا تدبر بڑا گھمبیر ہونا چاہیئے۔

ــــــ (○) ــــــ

عائشہ سلطانہ

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

برجستہ تقریر جسے ٹیپ ریکارڈر سے مرتب کیا گیا!

نیا زمانہ ___ عورت کے نقطۂ نگاہ سے

(پرویز صاحب نے اس خطیبہ کے تعارف کے سلسلہ میں کہا کہ اس طاہرہ بیٹی نے گزشتہ تین سال میں جس جذب و انہماک، ذوق و شوق، اور ثبات و التزام سے قرآن پڑھا اور علم حاصل کیا ہے، اس کی مثال ہمارے اس دور میں بہت کم ملتی ہے۔ اگر حالات مساعد رہے تو مجھے امید ہے کہ یہ بیٹی ہماری بہت سی توقعات کو پوری کریگی۔)

اس تعارف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مقررہ بہن نے کہا کہ بابا جی نے جن الفاظ میں میرا تعارف کرایا ہے، اسکے متعلق میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اس میں حقیقت سے کہیں زیادہ حصہ باپ کی شفقت کا ہے ــــ اور پھر اس باپ کی شفقت بیٹیوں کے لئے اس قدر عمیق اور شدید ہوتی ہے کہ اس میں نسبی رشتوں کی یاد بھی دھندلا جاتی ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ میں اگر اس معیار پر پوری نہ اتروں جو ان کے تعارف نے قائم کر دیا ہے تو اس کی ذمہ داری کوتاہیٔ پرواز سے کہیں زیادہ بلندیٔ بام ہوگی ــــ اس کے بعد میں اصل موضوع کی طرف آتی ہوں۔

تاریخ انسانیت اس پر شاہد ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ کوئی نظریۂ زندگی کوئی نظامِ حیات، زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے، تو دھڑکنے والے، زندہ قلوب کے اندر اس نظریہ یا نظام کو بدلنے کے لئے تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی تڑپ آگے چل کر، انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ یہ انقلاب کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مراد کی طرف لے جانے کے لئے دلیلِ راہ بنے۔ اس لئے کہ عقلِ انسانی کا طریق تجرباتی (TRIAL AND ERROR) ہے۔ اور تجرباتی طریق تو ناکام تجارب کی تلخ ناکامیوں کے بعد ہی بروئے کار لا سکتا ہے۔ اس وقت خدا کی راہ نمائی ہی مشعلِ ہدایت بن سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف زمانوں میں، مختلف اقوامِ عالم کی طرف، حضرات انبیائے کرام آتے رہے۔ نبی ایک عظیم داعیٔ انقلاب ہوتا تھا جو غلط نظامِ زندگی کی بساط اُلٹ کر اس کی جگہ صحیح نظام متشکل کرتا تھا۔ لیکن یہ انقلاب سب سے پہلے انسانوں کے قلب نظر میں پیدا کیا جاتا تھا ــــ کہ جس انقلاب کی بنیاد قلب و نظر کی تبدیلی پر نہ ہو، وہ فساد تو بن سکتا ہے انقلاب نہیں کہلا سکتا۔

انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ غلط اقدارِ حیات کی جگہ صحیح اقدارِ حیات انسانوں کے سامنے لائی جائیں۔ قرآن کریم کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ ـــ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ ـــ تو اس سے مراد ہی یہ ہے کہ یہ دستورِ حیات زندگی کی صحیح اقدار لے کر آیا ہے۔

اس تبدیلیٔ اقدار سے مراد کیا ہے' یہ چیز اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ اگر آپ تاریخ انسانیت کا ذرا گہرائی میں جا کر مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ برائیاں جب بھی بے نقاب سامنے آئی ہیں' تو انسان نے ان سے کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ اس نے دھوکا اس وقت کھایا ہے جب بدی' نیکی کا نقاب اوڑھ کر سامنے آئی ہے۔ جب جھوٹ سچ کا لبادہ پہن لیتا ہے اور جب یہ چلن عام ہوجاتا ہے تو اس طرح رفتہ رفتہ (IMMORALITY)-(MORALITY) بن جاتی ہے۔ اس طرح غلط اقدار' صحیح اقدار کے بہروپ میں' میر کارواں بن کر رہزنی کرتی ہیں۔ یہ وہ فریب کا جال ہے، جس سے انسان از خود نہیں نکل سکتا۔ یہی وہ فریب ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ـــ اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ـــ "وہ خود فریب جسے معائب' محاسن بن کر دکھائی دیں"۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ مذہب کی دنیا میں یہ تصور عام ہے کہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اسے ترک کر دینا، چھوڑ دینا، زندگی سے نفرت کرنا، اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنا بلکہ تراشنا، بہت بڑا حسنِ عمل ہے۔ یہ خدا پرستوں کی راہ ہے۔ اس سے انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ایک چھٹی حس (SIXTH SENSE) کی نمود ہوتی ہے جس سے انسان' ماوراء الکائنات فضاؤں میں اڑنے لگ جاتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ فریبِ نفس کیا ہے؟ ان' دنیا چھوڑ دینے کے مدعیوں میں سے کوئی بھی دنیا چھوڑنا نہیں چاہتا ـــــ اگر دنیا کا چھوڑ دینا ایسا ہی بڑا کارنامہ ہے تو ان حضرات کو دنیا چھوڑنے سے کون روکتا ہے۔ یہ خودکشی کرکے' دنیا کی آلائشوں سے پاک اور صاف کیوں نہیں ہوجاتے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ یہ اسی دنیا میں رہیں گے، اسی کی فضا میں سانس لیں گے، اسی کے سورج سے روشنی اور حرارت حاصل کرینگے، اسی کی زمین کا پیدا کردہ رزق کھائیں گے۔ اسی کے چشموں کا پانی پئیں گے۔ دوسرے انسانوں کی کمائی سے اپنی نشو ونما کا سامان حاصل کرینگے۔ لیکن یہ دوسرے انسانوں کی منفعت کے لئے کچھ نہیں کریں گے۔ انہیں اس کائنات کے سنوارنے کی قطعاً فکر نہیں ہوگی۔ ان کی زندگی کا مقصود، جینے کا منتہیٰ' "اپنی نجات" ہوگا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس سے بڑی خود غرضی (SELFISHNESS) کوئی اور بھی ہوسکتی ہے کہ انسان صرف اپنی ہی فکر کرے، کسی اور کی منفعت کے لئے کچھ نہ کرے۔ اسے آپ "خود غرضی" کہیئے تو ہر ایک کی نگاہ میں کھٹکے۔ لیکن جب آپ اسی خود غرضی پر ترکِ دنیا اور روحانیت کا مقدس لیبل لگا دیں تو یہ سب سے بڑی نیکی اور زندگی کا بلند ترین کارنامہ بن جاتے۔ اسے کہتے ہیں غلط قدر (WRONG CONCEPT OF MORALITY)۔ یہ ہے وہ مقام جہاں ایک آسمانی داعیٔ انقلاب آکر اس قسم کی باطل اقدار کی جگہ صحیح اقدار' صحیح پیمانے عطا کرتا ہے۔ وہ آکر اعلان کرتا ہے کہ یہ کائنات' انسان کے

لئے مسخر کر دی گئی ہے اور تمہارا فریضہ یہ ہے کہ اس کی قوتوں کو اپنے تابع تسخیر لا کر ان سے حسن کائنات میں اضافہ کرو اور انسان کی منفعت بخشیوں کو فروزاں سے فروزاں تر کرتے چلے جاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی خدا کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے۔ اس عطیہ کی قدر کرو۔ زندگی کی قدر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے سنوارو، نکھارو۔ اس کے لئے ضرورت ہے مسلسل جد و جہد کی، پیہم تگ و تاز کی، یکسر سعی و عمل کی۔ وہ کہتا ہے کہ نہ مادہ آلائشوں کی دلدل ہے جس میں انسانی روح آ کر پھنس گئی ہے اور نہ ہی مقصودِ حیات یہ ہے کہ انسان ان آلائشوں کے دھونے میں عمر صرف کر دے اور اس کے بعد یہاں سے جاتے تو اس شکل میں جس شکل میں وہ یہاں آنے سے پہلے تھا۔ آپ سوچئے کہ یہ کس قدر بے معنی مقصدِ حیات ہے — کس قدر بے مقصد پروگرام ہے — اور یہ پروگرام کس کا ہے؟ اس خدا کا جس نے پہلے ان مادی آلائشوں کو پیدا کیا۔ پھر اچھے بھلے، اُجلے نکھرے انسان کو اس میں دھکیل دیا — دھکیل دیا اور کہہ دیا کہ اب تم اس میں سے نکلو اور ساری عمر اس کے داغ دھبے دھوتے رہو تاکہ ہمارے سامنے اُسی شکل میں آؤ جس شکل میں تم ہمارے پاس پہلے تھے — یہ پروگرام کیا ہے؟ وہی جسے عام الفاظ میں یوں کہا جاتا ہے کہ — بیکار مباش کچھ کیا کر — کپڑے ادھیڑ کر سیا کر — رفیقانِ محترم! اس قسم کا بے معنی پروگرام — معاذ اللہ ثم معاذ اللہ — خدا کا عطا کردہ پروگرام یہ ہے کہ دنیاوی زندگی، انسانی منازلِ حیات میں سے ایک منزل ہے۔ وہ اس منزل میں آتا اسلئے ہے کہ اپنی جد و جہد اور سعی و عمل سے، اس منزل سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو سکے — وہ منزل جو اس منزل سے کہیں بلند، کہیں حسین اور کہیں جاذب ہے — زندگی اسی جد و جہد کا نام ہے۔ یہ شاعری نہیں، افیون نہیں، افسانہ نہیں، گونگے کا خواب نہیں، ایشور کی لیلا نہیں، مایا نہیں، فریب نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے، یہ ایک موقعہ ہے جو انسان کو اس کی خود آفرینی کے لئے دیا گیا ہے۔ اس خود آفرینی — اس ارتقاء کے لئے ایک ہی پروگرام ہے اور وہ ہے قوانینِ خداوندی کی اطاعت — ان قوانین کے دینے والے خدا کو ہم نہیں جان سکتے — لامحدود کبھی محدود میں سما نہیں سکتا۔ — لیکن ہم خارجی کائنات میں اس کے قوانین کی کارفرمائی کا نظارہ ہر روز کرتے ہیں، ہر آن کرتے ہیں — اور — یہ ان قوانین اور صرف ان قوانین کی اطاعت کا نتیجہ ہے کہ یہ کائنات باین حسن و خوبی اور باین نظم و ضبط کروڑہا کروڑ برسوں سے مصروفِ عمل ہے کہ اس میں (قرآن کے الفاظ میں) کہیں کوئی جھول نہیں۔ کوئی سلوٹ نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کائنات کی یہ ساری نقل و حرکت، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش ہو۔ اس سے کائنات میں خود ارتقاء ہو رہا ہے۔ یہ اسی ارتقاء کا تصدق ہے کہ جامد اور غیر ذی حیات مادہ سے زندگی کی نمود ہوئی۔ اس سے پہلا جرثومۂ حیات (LIFE - CELL) وجود میں آیا۔ یہ اپنے جوشِ نمو اور ذوقِ حیات سے رقصاں ہوا تو دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جن میں سے ایک نر تھا اور دوسرا مادہ — ان دونوں کے اختلاط سے ہزارہا ہزار انواع (SPECIES) وجود کوش ہو گئیں۔ انہی میں سے ایک ترقی یافتہ نوعِ انسان

کہلاتی ہے — اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک انسانی پیکر یا ہیئت کا تعلق ہے یہ فی الواقعہ سابقہ انواع کے مقابلہ میں بڑا (بلکہ سب سے زیادہ) ترقی یافتہ ہے لیکن جو کچھ اس نوع کے نر (آدمی) نے اپنی مادہ (عورت) کے ساتھ کیا ہے اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ تمام انواع میں پست ترین مقام پر دکھائی دے گا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ — کی یہ کس قدر عبرت آموز تفسیر ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے (یعنی مرد نے) ایک افسانہ وضع کیا — اور اسی افسانے سے میں اس موضوع کی ابتدا کرتا ہوں جو درحقیقت میرے آج کے خطاب کا مرکزی نقطہ ہے۔

اس افسانے میں کہا گیا ہے کہ اللہ میاں نے پہلے مرد کو پیدا کیا۔ اسی کی پیدائش مقصود بالذات تھی — چند دنوں کے بعد اللہ میاں نے دیکھا کہ یہ شہزادہ صاحب بہت اُداس اُداس سے رہتے ہیں۔ اس پر اس نے سوچا کہ ان صاحب کا دل بہلانے کے لئے اس کا جوڑا بنانا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے اللہ میاں کے پاس (معاذ اللہ) مٹی ختم ہو گئی — یعنی ہزاروں اور لاکھوں کائناتیں تخلیق کرنے کے لئے تو اس کے پاس سامان تھا اور آج تک ہے، لیکن عورت بنانے کے لئے اس کے پاس مٹی نہ رہی — اس کے لئے اس نے سوچا کہ مرد کے پہلو کو چیرا جائے اور اس میں جو زائد مٹی لگ گئی ہے اسے تراش اور کھرچ کر نکال لیا جائے اور اس سے اس کا جوڑا بنا دیا جائے۔ اس طرح عورت وجود میں لائی گئی یعنی عورت کی پیدائش مقصود بالذات نہیں۔ یہ صرف مرد کے دل بہلانے کا کھلونا ہے۔ اس کی اُداسی دور کرنے کا سامان ہے یوں عیسائیت — بلکہ اس سے بھی پہلے یہودیت کے افسانہ گردوں (سامریوں) نے اس افسانے کو تراشا۔ لیکن چونکہ یہ افسانہ مردوں کے لئے بڑا مفید مطلب تھا اسے بُری طرح سے اُچھالا گیا۔ چنانچہ دنیا کے مذاہب کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں اسے ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر نہ مانا جاتا ہو کہ عورت کی اپنی حیثیت کوئی نہیں، یہ مرد کے بہلاوے کا سامان ہے۔ یہ (معاذ اللہ) اللہ میاں کے چاہیتے مُنّے کا کھلونا ہے۔ اس افسانے کو مقدس لبادہ اڑھا کر عام کیا گیا، اور پھر اسے عورت کے دل میں اس طرح راسخ کیا گیا کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو یہی کچھ سمجھنے لگ گئی — مسلسل اور منظم پراپیگنڈہ فی الواقعہ شیر کو بکری بنا دیتا ہے۔

یہ بھی ایک باطل تدریجاً مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی کہ خدا کا آخری داعیِ انقلاب (علیہ التحیۃ والسلام) آیا اور اس نے خدا کا یہ پیغام عالمِ انسانیت تک پہنچا دیا کہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور جو مقصد ان کی تخلیق کا ہے وہی مقصد مرد اور عورت دونوں کی تخلیق کا ہے۔ ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر ذات (PERSONALITY) عطا کی گئی ہے — لڑکے کو بھی اور لڑکی کو بھی — اور "ذات" کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی ذات، کسی دوسری ذات کے مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ ہر ذات اپنا مقصد آپ ہے۔ اس لئے عورت، مرد کے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ یہ اپنی ذات میں، مرد کی طرح، اپنا مقصد آپ ہے۔

یہ ایک عظیم قدر تھی جسے انسانی نگاہوں کے سامنے لایا گیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب تھا جو دنیائے انسانیت میں برپا کیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد، مردوں نے اس آسمانی انقلاب کے صحیفہ کو نقش و نگار طاقِ نسیاں کر دیا۔ اور پھر سے اسی افسانہ کو وجہ گرمیٔ محفل بنا دیا جسے مٹانے کے لئے یہ صحیفہ آیا تھا۔ اب اس افسانے میں 'زیب داستاں کے لئے' کچھ اضافے بھی کئے گئے۔ کہا گیا کہ عورت چونکہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اس لئے یہ کبھی سیدھی نہیں ہوگی۔ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو یہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ اس لئے اسے ٹیڑھا ہی رہنے دو اور اسی طرح اس سے تھوڑا بہت کام لے لو۔ کہیں کہا گیا کہ مرد کو حق حاصل ہے کہ عورت کو مارے پیٹے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس سے پوچھے کہ تم اسے کیوں پیٹتے ہو۔ قرآن نے آکر یہ بتایا تھا کہ اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہے۔ کسی اور کی نہیں۔ اگر اس اطاعت میں کسی اور کی اطاعت شامل کرلی جائے تو وہ شرک ہے ۔۔۔ اور شرک ایسا سنگین جرم ہے جس کی معافی نہیں ہوسکتی ۔۔۔ جو جرم انسان کو شرفِ انسانیت سے محروم کردے اس سے زیادہ سنگین جرم اور کونسا ہوسکتا ہے ۔۔۔ لیکن اب عورت سے، ہاں مسلمان عورت سے 'توحید پرست عورت سے ۔۔۔ یہ کہا گیا کہ خاوند تیرا مجازی خدا ہے اور اس مجازی خدا کی اطاعت تیرا مذہبی فریضہ ہے ۔۔۔ حقیقی خدا کو تو کسی نے دیکھا نہیں لیکن یہ مجازی خدا صاحب 'ہر وقت ڈنڈا لئے موجود ہیں۔ ان کے کسی حکم سے ذرا سرتابی برتی' اور عورت جہنم میں گری۔ یہی وجہ ہے جو یہ کہا گیا کہ جہنم میں سب سے زیادہ تعداد عورتوں کی ہوگی۔ اس لئے کہ مردوں کو تو صرف ایک خدا کی اطاعت کرنی ہوتی ہے اور عورت بیچاری کو دو خداؤں کی ۔۔۔ ایک آسمان کا خدا اور ایک زمین کا خدا ۔۔۔ اس کے لئے جنت میں جانے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ اپنے خاوند کی اطاعت کرے ۔۔۔ جس قدر یہ خاوند کی اطاعت کریگی، اتنے ہی اسکے درجات بلند ہوتے جائیں گے ۔۔۔ آپ کو رابعہ بصری کا قصہ تو معلوم ہی ہوگا ۔۔۔ سوتے میں مجازی خدا نے پانی مانگا۔ یہ فوراً اٹھ کر پانی کا کٹورا ہاتھ میں لے کر، ان کے سرہانے پہنچیں تو وہ پھر سو گئے تھے۔ اب رابعہ نے سوچا کہ اگر میں واپس چلی جاتی ہوں تو معلوم یہ کس وقت پھر پانی مانگ لیں اور مجھے آنے میں دیر لگ جائے۔ اس لئے وہ اسی طرح پانی لئے سرہانے کھڑی رہیں ۔۔۔ سردی کی رات۔ ٹھنڈے پانی کا کٹورا ہتھیلی پر ۔۔۔ ساری رات اسی طرح کھڑے کھڑے گذار دی ۔۔۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ صبح ہوتے ہوتے اس بیچاری کو جاڑا لگ کر لرزے کا بخار ہوگیا ہوگا ۔۔۔ جی نہیں ۔۔۔ صبح ہوئی تو رابعہ ولی اللہ بن چکی تھیں ۔۔۔ یہ تھا خاوند کی اطاعت اور خدمت کا صلہ!

برادرانِ عزیز! رابعہ بصری کے ولی اللہ بن جانے کا قصہ تو ہمارے ہر گھر میں دہرایا جاتا ہے لیکن ہمارے سامنے مذہبی لٹریچر میں ۔۔۔ اور ہمارے ہی کیا دنیا بھر کے مذہبی لٹریچر میں ۔۔۔ آپ کو کہیں یہ لکھا نہیں ملے گا کہ کوئی مرد اپنی بیوی کی خدمت سے ولی اللہ بن گیا ۔۔۔ بیوی کی خدمت سے اولیاء اللہ بن جانا تو ایک طرف' اولیاء اللہ کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ عورت سے نفرت کرتے ہیں۔ عائلی زندگی سے گریز کرتے ہیں۔ عورت سے دور بھاگتے ہیں۔

اور اس دور بھاگنے اور نفرت کرنے کے نتیجہ میں روحانیت کے بلند ترین مقامات تک پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ رام، ایشور کا اوتار کس عمل کے نتیجہ میں بنا تھا۔ نہ معلوم ہو تو سن لیجئے۔ وہ اپنی بیوی سیتا کو واپس لا کر خوش و خرم گھر میں بس رہا تھا کہ ایک دن ایک گلی میں سے گذرتے ہوئے اس نے سنا کہ ایک دھوبی، اپنی دھوبن سے کہہ رہا ہے کہ تو سیدھی ہو جا۔ جب رام نے سمجھا جو بارہ برس تک راون کے ہاں رہنے کے بعد بھی سیتا کو گھر لے آیا۔ میں تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ رام نے یہ سنا اور گھر آ کر سیتا کو بن باس دے دیا ـــ حالانکہ ان کی (MYTHOLOGY) کی رُو سے، اگنی دیوی نے خود سیتا کی پاکبازی کی شہادت دی تھی ـــ رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا اور اس حسنِ عمل کے صدقے میں وہ ایشور کا اوتار بن گیا۔

یہ ہے عورت کی حیثیت، مرد کی نگاہ میں۔ البتہ اس کی ایک حیثیت ایسی ہے جس کی تعریف ضرور ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اس کی ماں کی حیثیت ـــ لیکن میرا خیال ہے کہ ماں کی تعریف بھی اس مجبوری کے ماتحت ہے کہ ـــ "کافر نتوانی، ناچار مسلماں شو" ـــ مرد نے دیکھا کہ ماں سے کسی حالت میں مفر نہیں۔ اس وقت تک کوئی ایسا طریقِ عمل ایجاد نہیں ہوا جس سے ماں کے بغیر، افزائشِ نسل ہو سکے۔ اسی لئے مردوں نے ماں کو ایک لاینفک شر (INDISPENSABLE EVIL) سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ اور ماں کی مدح و ستائش میں قصیدے پڑھنے لگ گئے۔

عزیزانِ من! میرا مطلب یہ نہیں کہ عورت کو ماں نہیں بننا چاہیئے اور اسے اچھی ماں نہیں ہونا چاہیئے یا ماں کی حیثیت سے اس کی عزت اور تعریف نہیں ہونی چاہیئے۔ میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ جس طرح باپ کی خصوصیت صرف یہی نہیں ہوتی کہ وہ باپ ہے۔ مرد ہونے کے اعتبار سے اس کی اور بھی بہت سی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اسی طرح عورت کی خصوصیت صرف یہی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ ماں ہے۔ عورت ہونے کی جہت سے (بلکہ انسان ہونے کی جہت سے) اس کی اور خصوصیات بھی تو ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو بڑا دلچسپ تماشہ ہوتا ہے۔ ایک گھر میں ایک ہی عورت، مرد کی بیوی ہونے کی جہت سے ٹیڑھی پسلی اور جہنم کا کندہ ہوتی ہے۔ اور وہی عورت، اُس مرد کے بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے ایسی مقدس کہ بہشت اس کے پاؤں کے نیچے ہوتا ہے ـــ یعنی خود وہ جہنم میں ہوتی ہے اور جنت اس کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے ـــ آپ نے دیکھا کہ عورت کو صرف ماں کی حیثیت سے واجب العزت سمجھنے کا منطقی نتیجہ کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔!

قرآن مجید نے حضرات انبیاء کرامؑ کے ساتھ ایک عظیم انقلابی عورت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بڑی شرح و بسط سے ذکر کیا ہے۔ یہ جلیل القدر عابدہ حضرت مریمؑ ہیں ـــ ان کی انقلابی روح کا اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہودیوں کی مذہبی پیشوائیت کس قدر جابرانہ اور مستبد اقتدار کی مالک تھی، اور ہیکل کا فولادی شکنجہ کس قدر

ہستیوں شکن تھا۔ اس پاکباز، بلند سیرت لڑکی نے، اس ہیکل کے غیر خدائی ضابطۂ خانقاہیت کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اور ان کی سخت مخالفت کے علی الرغم، متاہل زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے اس فیصلہ پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یہ یہودی مسلکِ خانقاہیت کے خلاف بہت بڑا جہاد تھا اور قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کا تذکرہ اسی جہت سے کیا ہے۔ لیکن ہم نے، ان کی اس حیثیت کو یکسر چھپا دیا۔ اور حضرت مریم کا تعارف صرف اس حیثیت سے کرایا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی ماں تھیں اور بس۔ یعنی ان کی اپنی حیثیت کچھ نہیں۔ ان کی عظمت محض "اُمِ عیسیٰؑ" کی جہت سے ہے۔ آپ نے دیکھا کہ "عورت بحیثیت ماں" کا تصور ہمیں کس مقام تک لیجاتا ہے۔

عزیزانِ محترم! قرآن مجید نے صحیح انسانی معاشرہ کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں ــــ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ــــ کی کیفیت ہوگی۔ یعنی اس معاشرہ میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے اس قسم کی سیکیورٹی کی ضمانت لاینفک ہے۔ جس معاشرہ میں افراد کو یہ سیکیورٹی حاصل نہ ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ افراد کبھی قامتِ انسانیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ بچپن ہی سے لڑکی کے کان میں اس قسم کی باتیں ڈالی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو انتہائی (INSECURE) غیر محفوظ خیال کرے۔ یہ خیال اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا جاتا ہے کہ وہ ہر بات میں مرد کی محتاج ہے۔ وہ اپنی حفاظت آپ نہیں کر سکتی۔ اس کی حفاظت صرف مرد کر سکتا ہے۔ وہ نہ اپنی روٹی آپ کما سکتی ہے، نہ اپنی زندگی آپ جی سکتی ہے۔ وہ لڑکی ہے تو باپ اور بھائیوں کی محتاج ہے۔ بیوی ہے تو خاوند کی محتاج ہے اور ماں ہے تو بیٹوں کی محتاج اور دست نگر ــــ غرضیکہ اس کی ساری زندگی خوف اور عدم اعتماد کے چھلاووں میں گھری رہتی ہے۔ اور یہ اس رسولِ گرامیؐ کے نام لیواؤں کی حالت ہے جن سے جب پوچھا گیا کہ آپ جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیت کیا ہوگی۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس میں کیفیت یہ ہوگی کہ ایک عورت یمن سے شام تک کے صحراؤں میں تنہا سفر کرے گی اور اسے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہیں ہوگا ــــ آپ نے غور فرمایا کہ حضورؐ نے اس مثالی مملکت کی اس خصوصیت میں عورت کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ عورت دنیا میں سب سے زیادہ غیر محفوظ اور خوف زدہ مخلوق تھی۔ اس لئے جس مملکت میں عورت اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھے، اس سے بڑھ کر مثالی مملکت اور کونسی ہو سکتی ہے؟

اور حضورؐ نے اس مثالی مملکت کی تشکیل کی ابتداء خود اپنے مقدس ہاتھوں سے کر دی تھی۔ آپ کی تعلیم و تربیت نے عورت میں کس قدر جرأت اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔

بریرہ مدینہ میں ایک شخص کی لونڈی تھی جسے اسلامی نظام میں بیوی کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اسنے اپنے خاوند (یا یوں کہئے کہ اپنے آقا) کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس شخص کی درخواست پر حضورؐ نے ایک دن بریرہ

سے کہا کہ تم اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤ ۔۔۔ غور فرمایئے کہ کہنے والا کون ہے اور وہ یہ بات کہہ کس سے رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس لونڈی نے جواب کیا دیا۔ اس نے کہا کہ حضورؐ! آپ نے جو ارشاد فرمایا ہے وہ وحی کی رُو سے ہے یا آپؐ کا ذاتی مشورہ ہے۔ اور جب آپؐ نے کہا کہ وہ ان کا ذاتی مشورہ ہے تو بریرہ نے نہایت آزادی سے کہا کہ پھر معاف فرمایئے میں اپنے حالات کو آپ بہتر سمجھتی ہوں۔ اور یہ جواب سن کر رسول اللہ مسکرا کر ایک طرف کو تشریف لے گئے اور لونڈی اطمینان سے دوسری طرف چلی گئی۔

غور فرمایا آپ نے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کا کیا مقام تھا؟ مقامِ انسانیت! حضورؐ نبی اکرمؐ نے جب اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس میں فرمایا تھا۔ بل ھو الرفیق الاعلیٰ ۔۔۔ تو اس میں شرفِ انسانیت کا ایک عظیم نکتہ پنہاں تھا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ اور تو اور خدا اور بندے کا رشتہ بھی رفاقت کا ہے۔ سو آپ سوچئے کہ جس دین میں خدا اور بندے کا رشتہ بھی رفاقت کا ہو کیا اس میں یہ ممکن ہے کہ جب کسی عورت کا رشتہ ایک مرد کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہو تو وہ رفاقت کی مساوات کا رشتہ نہ ہو بلکہ اس کے لئے "خدا" ڈھونڈا جا رہا ہو؟ خدا کا رسولؐ خدا کو بھی رفیق قرار دیتا ہے اور اس کی امت "ایک انسان کو" مجازی خدا "بنا رہی ہے۔ یا للعجب!

یہ ہے عورت کی حالت مشرق میں۔ لیکن ہم لوگ مغرب کی عورت کی طرف بڑی بلند توقعات کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنے آپ کو مرد کے چنگل سے آزاد کر لیا ہے اور اس طرح اس نے وہ آزادی حاصل کر لی ہے۔ جس کی طرف مشرق کی عورتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہمارا فریب نگاہ ہے۔ مغرب کی عورت کی آزادی یقیناً نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن ۔۔۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ عورت جس قدیم مقدس افسانے میں الجھائی گئی تھی ۔۔۔ کہ وہ مرد کا دل بہلانے کے لئے ایک کھلونا ہے ۔۔۔ مغرب کی عورت اس افسانے کے فریب سے نکل گئی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ وہاں کیفیت یہ ہے کہ مرد عورت کا شکاری نہیں بلکہ ۔۔۔ صید خود صیاد را گوید بگیر ۔۔۔ وہاں شکار خود شکاری کو آوازیں دے دیکر بلاتا ہے۔ مغرب کی عورت دن بھر انتہائی محنت مشقت سے کماتی ہے اور پھر اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کاسمیٹک، کریم، پوڈر جیسا سامانِ دلکشی خریدتی ہے کہ اس طرح مرد کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ یعنی وہ خود اس کا اعتراف کرتی ہے کہ اس کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں۔ وہ مرد کی دلکشی کا سامان ہے ۔۔۔ ان حالات میں میری عزیز بہنو! یہ ہماری غلط فہمی ہوگی اگر ہم یہ سمجھیں کہ ہمیں صحیح مقامِ انسانیت حاصل کرنے کے لئے مغرب کی عورت سے کوئی راہ نمائی ملے گی۔ اس کے لئے ہمیں صحیح اور مؤثر راہنمائی خدا کی کتاب عظیم کے سوا اور کہیں سے نہیں مل سکے گی۔ اسی کی تعلیم سے عورت اس حقیقت کو پا سکیگی، کہ اس کی اپنی مستقل حیثیت ہے، منفرد ذات ہے، انفرادی تشخص ہے۔ اس کی تخلیق مقصود بالذات ہے۔ وہ مرد ہی کی طرح ایک صاحبِ اختیار و ارادہ خود مکتفی اور خود اعتماد انسان ہے۔ جس دن عورت، قرآن کی روشنی میں اس

طرح خود آشنا ہو جائے گی، وہ دن انسانیت کی تاریخ میں یادگار ہوگا۔ اس دن آدھی انسانیت ان اغلال و سلاسل سے آزاد ہو جائے گی جن میں وہ صدیوں سے بُری طرح جکڑے چلی آ رہی ہے۔ اس دن ہم کہہ سکیں گے کہ عورت اور مرد مساویانہ رفاقت کے رشتے میں منسلک ہو کر اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ سفرِ حیات میں شانہ بشانہ قدم بڑھاتے ہوئے چل سکیں۔ یہی وہ زمانہ ہوگا جسے قرآن کی روشنی میں ــــ نیا زمانہ اور نئے صبح و شام کہا جائیگا۔ والسلام!

(۰)

نجمہ کوثر

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

صدرِ محترمہ و بزرگانِ گرامی قدر!

پچھلے سال جب میں نے کنونشن کے پنڈال میں حضور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث آویزاں دیکھی جس میں لکھا تھا کہ

"جس شخص کے دو دن ایک جیسے گذر گئے سمجھ لو کہ وہ تباہ ہو گیا"

تو میں کتنے عرصہ تک اس پر غور کرتی رہی۔ میں نے سوچا کہ ہمارے رسولِ کریمؐ کے سامنے تو زندگی کا یہ نقشہ تھا کہ ہر آنیوالا دن گزرے ہوئے دن کے مقابلہ میں زیادہ روشن اور تابناک ہونا چاہیئے۔ لیکن اس رسولؐ کی اُمت کی یہ حالت ہے کہ اُس کے آسمان پر ایک ہزار سال سے نیا سورج طلوع ہی نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس قوم کی دنیا میں آسمان کی سب گردشیں ساکن ہو گئی ہیں اور ساکن بھی ہوئی ہیں رات کے وقت جب چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھیئے تو اس مذاکرہ کا یہ عزم کہ

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

درحقیقت تاریخ کا دھارا موڑنے اور گردشِ آسمان کا رُخ بدلنے کا عزم ہے۔ بہت بڑا ہے یہ عزم! اور بڑا ہمت طلب ہے یہ ارادہ۔ خدا اس میں ہمیں کامیابی عطا فرمائے۔

لیکن اس عزم کو لے کر آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ کونسی قوتیں ہیں جو ہماری قوم کے آسمان کی گردش کو اس بُری طرح سے روکے کھڑی ہیں۔ اس لئے کہ جب تک ان مخالف قوتوں کا سُراغ نہیں ملے گا ہم انہیں راستے سے ہٹائیں گے کس طرح؟ ان کا پتہ نشان علامہ اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں بڑی وضاحت سے دیا ہے۔ اس میں ابلیس اپنے چیلے چانٹوں سے کہتا ہے کہ یاد رکھو ؎

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اُس خدا اندیش کی تاریک رات

اس کے بعد وہ بتاتا ہے کہ اس کے لئے تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جُدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے!
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

یعنی تم اس قوم کو اس قسم کے نظری مسائل کے گورکھ دھندوں میں الجھائے رکھو تاکہ یہ آپس میں دست و گریباں ہوتے رہیں اور زندگی کے عملی مسائل کی طرف اِن کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔

تم اِسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی پر اسکے سب مہرے ہوں مات

اب آپ خود سوچ لیجئے عزیزانِ محترم! کہ ہمارے معاشرہ میں یہ خدمت کون سرانجام دے رہا ہے۔ یہ ہیں خیر سے ہمارے اربابِ شریعت۔ اس کے بعد آگے بڑھیئے۔ اُس نے کہا کہ دوسری طرف کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

یہ خدمت انجام دے رہے ہیں ہمارے ہاں کے "ڈیرہ پیر"۔ یاد رکھیئے! ڈیرہ پیر کسی خاص فرد کا نام نہیں۔ ڈیرہ اور پیر لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ فرق صرف ڈیروں کی شکلوں اور سائزوں میں ہوتا ہے۔

یہ ہیں وہ قوتیں جو اس خدا اندیش کی تاریک رات کو روشن نہیں ہونے دیتیں۔ جب تک انہیں راستے سے نہیں ہٹایا جائے گا ہماری جبین پر نئی سحر نمودار نہیں ہوگی۔ اس مہم کی کامیابی کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے اٹھایا جائے تو پھر استقامت سے مسلسل آگے بڑھایا جائے۔ چار قدم چل کر چھوڑ نہ دیا جائے۔ اس لئے کہ میں جب اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتی ہوں تو مجھے نظر یہ آتا ہے کہ ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ ؎

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے!

اور یہ مرحلہ تو اتنا نازک ہے کہ سوجانا تو ایک طرف اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

اس لئے اس عزم کو لے کر آنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ یہ جہاد یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم بھی چاہتا ہے۔

اور دوسری شرط یہ ہے کہ ہم ڈوبنے والے ستاروں کے ڈھندلکے کو کہیں نورِ سحر نہ سمجھ بیٹھیں۔ ہماری تاریخ اس قسم کی سحر کارانہ خود فریبیوں سے بھری پڑی ہے کہ

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

کہیں یہ کچھ ہمارے ساتھ بھی نہ ہو جائے۔ اس دھوکے سے صرف قرآن کا آفتاب جہاں تاب ہی بچا سکتا ہے۔

والسلام!

سلمیٰ پرویز

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

میرے واجب الاحترام بزرگو! اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو!

کہتے ہیں کہ صبح کا بھولا شام گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہنا چاہیئے۔ گذشتہ کنونشن کے مذاکرہ کا عنوان تھا

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی!

اس سلسلہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ جو سحر چاند کا چہرہ زرد ہو جانے اور ستاروں کی چمک دمک ماند پڑ جانے کے بعد طلوع ہوتی ہے وہ فطرتِ مجبور کے لگے بندھے قاعدے کے مطابق نمودار ہوتی ہے۔ اُسے نہ کسی کی شدتِ آرزو وقت سے پہلے لاسکتی ہے اور نہ ہی جب وہ شام کو رخصت ہونے لگتی ہے تو کسی کا دستِ شوق اسکا دامنگیر ہو سکتا ہے۔ یہ سحر خارجی کائنات کی سحر ہوتی ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں سحر انسانی اعمال و کردار کے نور جبیں سے ضیا بار ہوتی ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ ہم کچھ کریں یا نہ کریں، سحر اپنے وقت پر پیدا ہو کر رہیگی، ہمیں چاہیئے کہ ۔

لے کہ خورشید جہاں تاب سے مقراضِ شعاع
دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کریں

غنیمت ہے کہ اس دفعہ اصحابِ کہف نے ایک ہلکی سی کروٹ لی ہے اور مذاکرہ کا عنوان یوں بدلا ہے کہ

نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

مجھے اس سے تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ ۔

ہے جو ناشنیدہ سی فغاں میں ابھی　　　لوگ باقی ہیں کچھ جہاں میں ابھی

لیکن اب بھی ہوا اتنا ہی ہے کہ ہر آنے والا دوسرے سے کہہ گیا ہے کہ میاں! نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرا یعنی تم نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرو!

وَ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ

ہم قوم موسےٰ کی طرح یہاں بیٹھے ہیں۔ جب نئے صبح و شام پیدا ہو جائیں تو ہمیں آواز دے دینا۔ ہم فوراً موقعہ پر پہنچ جائینگے۔

میرے بزرگو اور عزیز بھائیو! نیا زمانہ اور نئے صبح و شام تو انہیں کے ہاتھوں سے پیدا ہوں گے جو خورشید جہاں تاب سے مقراضِ شعاع لے کر اٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور اپنے ساتھیوں سے پکار کر کہیں کہ آؤ

دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کریں

اس میں شبہ نہیں کہ آپ حضرات کی سالہا سال کی کوششوں سے سونے والے اتنا تو سمجھ گئے ہیں کہ

اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ

نیند سے صلوٰۃ بہتر ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تو معاف فرمایئے میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ

اثرِ خواب ہے اذاں میں ابھی

جب تک ہماری اذانوں سے اثرِ خواب زائل نہیں ہوگا، نہ سونے والے جاگیں گے اور نہ ہی نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا ہونگے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہماری اذانوں میں اثرِ خواب ہے اور سونے والوں کی کیفیت یہ کہ

دیوانے کو نیند آگئی تاریکیٔ شب میں
سویا ہے تو اب خوفِ سحر سے نہیں اٹھتا

سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں نیا زمانہ اور نئے صبح و شام کیسے پیدا ہونگے؟ آپ بڑے بڑے دماغوں والے بزرگ ہیں، آپ کی سوچیں بھی دور دور تک جاتی ہیں۔ لیکن آپ کی اس چھوٹی سی بیٹی کے نزدیک اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ طریق وہی ہے جسے یہ چھ سات سال سے مسلسل ہر کنونشن میں آپ بزرگوں کے سامنے پیش کئے چلی آ رہی ہے۔ یعنی یہ کہ آپ ہماری تعلیم کا صحیح انتظام کیجئے۔ اس کے نظام کو قرآن کے قالب میں ڈھالئے، اپنی درس گاہ قائم کیجئے۔ اس میں نونہالانِ ملت کی صحیح تعلیم و تربیت کیجئے۔ اُن کی ذہنیت بدلئے۔ اُن کے زاویۂ نگاہ میں صحیح تبدیلی پیدا کیجئے۔ یہ بچے جب اپنے ذہنوں میں نئے اُفق لے کر اُبھریں گے تو ان کے ہاتھوں نئے زمانے اور نئے صبح و شام پیدا ہونگے۔ یہ خود آگے بڑھیں گے اور ہر رجعت پسند سے اُس کا کندھا جھنجھوڑ کر کہیں گے کہ

منزلوں کے نشان تو آگے ہیں　　پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتا کیا ہے؟

اُس وقت قرآن کے الفاظ میں ہر سیاہ تاثر شق ہو جائے گا۔ زرد روستارے جھڑ جائیں گے۔ تقویمِ کہنہ کا پابند سورج ماند پڑ جائے گا۔ اور زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی اور اس طرح ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو پھر آپ کے اُفقِ ملی پر صبحِ صادق کبھی ضو فشاں نہیں ہوگی۔ جو سحر بھی نمودار ہوگی اُسے دیکھ کر آپ بصد حسرت و یاس پکار اٹھیں گے۔ کہ

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!

—— (o) ——

ارشاداتِ صدرِ مذاکرہ

معزز حاضرین و حاضرات!

میرے نہایت عزیز اور محترم برادرِ بزرگ پرویز صاحب کا طبعی انکسار بعض اوقات دوسروں کے لئے بڑی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ اس الجھن کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ انہوں نے مجھے کرسیٔ صدارت پر بٹھا دیا..... اور خود سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ بڑے بھائی چھوٹی بہنوں کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں اُس کا ایک انداز یہ بھی ہے۔ بہر حال میں اس عزت افزائی کے لئے دل و جان سے مشکور ہوں۔

عزیزانِ من! یورپ کے سفر سے واپسی پر سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ

اپنی قوم کے لئے میں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے ہیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی کہیں میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب بھی میں نے مہذب اور صاحبِ علم انسانوں کی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ عمارتیں اور شگفتہ پھول نظر آئے، یہاں تک کہ جب بھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی۔ اور رنجیدہ ہو کر بے ساختہ کہا کہ ہائے! ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔

میں نے حاضرین! قریب ۳ سال کا عرصہ یورپ میں گزارا۔ اور پچھلے ہی سال قریب ۹ ماہ کا عرصہ امریکہ میں گزارنے کا موقعہ ملا۔ یقین مانیئے ان ممالک میں میری کیفیت ہمیشہ وہی ہوتی تھی جس کا ذکر سرسید نے اپنے خط میں کیا ہے——

علامہ اقبال نے کیا صحیح کہا ہے کہ ؎

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں!

میں نے یہ کیفیت مغربی ممالک میں دیکھی کہ ہر نیا سورج اُن کے لئے نیا پیغام زندگی لاتا ہے۔ میں جب وہاں اِس کیفیت کو دیکھتی تو ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ مجھے اپنی قوم یاد آجاتی جس کے آسمان پر صدیوں سے نیا سورج طلوع ہوا نہیں ہوا۔ اور جس کے مقدر کے ستارے اپنے اپنے مقام پر ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں۔

میں جب یورپ سے واپس آئی تو اپنے ملک کی حالت دیکھ کر بڑی مایوس ہوئی۔ میری آنکھیں صاف جگہوں اور خوشحال ماحول کو دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ یہاں جگہ جگہ پر غلاظت کے ڈھیر بھنبھناتی مکھیاں، ننگے فاقہ زدہ غلیظ بھکاری بچے، اپاہج گداگر اور مریض بھکاریوں کو فٹ پاتھ پر سسکتا دیکھ کر میرا دل خون ہو جاتا۔ غرضیکہ سخت دل گرفتہ تھی۔ اور ممکن تھا کہ مایوس ہی ہو جاتی کہ میرا لاہور آنا ہوا۔ یہاں میرے بڑے بھائی بلند اقبال نے مجھے بتایا کہ وہ ہر اتوار کو درس قرآن سننے جاتے ہیں۔ میں نے اُن کی بات پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ سوچا، ہونگے کوئی مولوی صاحب! اور مجھے ان مولویوں سے ہمیشہ سے چڑ تھی۔ ان کے بتائے ہوئے اسلام سے میں کبھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ مگر اپنے بھائی کے اصرار پر اگلی اتوار کو اُن کے ساتھ درس پر آگئی۔ اور پہلا درس سننے کے بعد ہی میں دل و جان سے محترم پرویز صاحب کے پیغام کی قائل ہوگئی۔ میں دل ہی دل میں کچھ اسی قسم کے اسلام پر ایمان لائی ہوئی تھی۔ مگر محدود علم ہونے کی وجہ سے اپنے خیالات کو دل ہی میں رکھنے پر مجبور تھی۔ میں نے پرویز صاحب کی تقریباً سب کتابیں پڑھ ڈالیں اور پھر دل کے پورے خلوص اور اطمینان کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوگئی۔ آج بھی اس واقعہ کو اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سمجھتی ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اُس دن برادرم بلند اقبال کے ساتھ اس درس پر آگئی اور یوں اپنی منزل پالی۔ اب میرا دل پُر امید ہے کہ اس تحریک کی بدولت ایک دن (زود یا بدیر) آئے گا ضرور جب میری قوم کا شمار دُنیا کی ترقی یافتہ قوموں سے ہوگا۔ اگرچہ مجھے اس چیز کا بھی پورا احساس ہے کہ یہ کوئی سہل کام نہیں۔ اور جس طرح ابلیس کی برسوں کی محنتوں نے اِس قوم کو مزاجِ خانقاہی میں پختہ کر دیا اور تقدیر کا سبق ازبر کرا دیا، اُسی طرح ہی اس قوم کو اپنے کو پہچاننے اور باطل نظریات اور عقاید چھوڑنے میں وقت لگے گا۔

پرویز صاحب کی قرآنی فکر نے، خاموشی ہی خاموشی سے قوم کے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں کس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا ہے اس کا اندازہ آپ نے ان تقاریر سے لگا لیا ہوگا جو اس طبقہ کے ترجمانوں نے ابھی ابھی اس اسٹیج سے کی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کا انداز الگ، طرزِ بیان جداگانہ اور طریق استدلال منفرد تھا۔ لیکن نقطۂ نگاہ اور نصب العین سب کا ایک ہی تھا۔ اسے کہتے ہیں صحیح انقلاب کہ

باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

میں ان نوجوان بچوں اور بچیوں کے خطابات کو سن رہی تھی تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے ایک ایک لفظ میں کس طرح ہماری نئی نسل کے دل کی دھڑکنیں موجزن ہیں، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اتنے انقلاب آفریں موضوع پر ایسے جوش اور ولولے کے ساتھ .... اظہارِ خیال میں ان کے ہاتھ سے کہیں اعتدال کا دامن چھوٹنے نہیں پایا۔ اور کسی مقام پر بھی یہ حقیقت سے ہٹ کر جذبات میں نہیں کھو گئے۔ میرے نزدیک قلب و نظر کی یہ تبدیلی اور اس کے ساتھ جذبات میں یہ نظم و ضبط، ہمارے اس قرآنی معلّم کی تربیت کا صدقہ ہے۔ آپ دور دور تک نظر دوڑاتے اور دیکھئے کہ دیوانگی اور فرزانگی کا ایسا حسین امتزاج آپ کو کہیں اور بھی دکھائی دیتا ہے؟

جب میں ان نوجوانوں میں اس قسم کا صحیح انقلاب دیکھتی ہوں تو ہر بار دل کی یہ آرزو حسرت بنکر لب پر آجاتی ہے کہ اے کاش! ہم ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد ڈال سکتے جس میں ہمارا یہ عظیم مفکر اور مشفق باپ کچھ بچوں کو لے کر بیٹھ جاتا، اور ان کی صحیح تعلیم و تربیت سے ایک ایسی نسل پروان چڑھا جاتا جو قوم کی زندگی میں فی الحقیقت ایک نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتی۔

آخر میں میں بزم طلوع اسلام کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جو ہر سال اس کنونشن کے انعقاد سے اس قسم کی حسین و سادہ و رنگین محفلیں آراستہ کرنے کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اور میں اپنی اور آپ سب کی طرف سے شکریہ ادا کرتی ہوں ان تمام مقررین کا جنہوں نے اپنی فکرِ بلند اور ذوقِ سلیم سے گذرگاہِ خیال کو تختۂ گل بنا دیا۔ اور سب سے آخر میں تمام قوم کی طرف سے ہدیۂ صد تبریک پیش کرتی ہوں اس عظیم مفکرِ قرآن کی خدمت میں جس کے جہادِ مسلسل کا نتیجہ اس حسین انقلاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے ما شاء اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ صحت اور توانائی عطا فرمائے تاکہ یہ اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے اس شجرِ طیّب کے برگ و بار اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

میں اب سامعین کے شکریہ کے ساتھ اس محفل کے برخاست ہو جانے کا اعلان کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ یہ محفل ایسی دلچسپ تھی کہ اس سے اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی کمی یوں پوری ہو جاتی ہے کہ اس کے بعد جس محفل کا انعقاد ہوگا وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور مفید ہوگی۔ یعنی پرویز صاحب کی مجلس استفسارات!

والسلام!

---(۰)---

کراچی میں　اسلام: اے چیلنج ٹو ریلیجن

ملنے کا پتہ:- ۱۰۰/۴۔ کوئینس روڈ (بالمقابل والیکا محل) نیو ٹاؤن کراچی ۵

بابُ المراسلات

ایک نہایت اہم سوال

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب نے اپنے مندرجہ ذیل خط میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اس پر انتہائی سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ستمبر ۱۹۶۵ء کی بھارت و پاکستان کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی اس میں مقبوضہ کشمیر سے بہت سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان اور آزاد کشمیر میں آ گئے تھے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کی منکوحہ بیویاں مقبوضہ کشمیر میں رہ گئی تھیں اور کئی ایسی مسلمان عورتیں ہیں جن کے خاوند مقبوضہ کشمیر میں رہ گئے تھے اور وہ اپنے والدین کے ہمراہ یا رشتہ داروں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر کے آ گئی تھیں۔ اب نہ ہی وہ عورتیں پاکستان سے واپس جا سکتی ہیں اور نہ ہی وہ عورتیں مقبوضہ کشمیر سے آ سکتی ہیں جو ادھر رہ گئی ہیں۔ ان میں بالکل نوجوان عورتیں بھی ہیں جو والدین کے سر پر بوجھ بھی ہیں اور ان کے سروں پر لٹکتی تلوار بھی ہیں۔ کیونکہ کسی بھی وقت اُن کی ذرا سی لغزش سے اُن کی عزت و وقار اور ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکل سکتا ہے۔ جن عورتوں کے خاوند بھارت میں رہ گئے ہیں، اُن کو خط کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ چونکہ نہ تم پاکستان آ سکتے ہو اور نہ ہی یہاں سے کوئی اُدھر جا سکتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ ... بذریعہ خط وہاں سے طلاق بھیج دیجائے۔ لیکن اُدھر سے یا تو جواب ہی نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو وہ بھی انکاری کا۔ یعنی وہ طلاق دینے پر رضامند نہیں۔ اب جنگ بند ہوتے تین سال سے زاید ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ طلاق نہ ملنے کی وجہ سے دوسری شادی بھی نہیں کر سکتیں کیونکہ یہاں پر اُس کے علاوہ جہاں جہاں بھی ایسے حالات ہیں علماء سے پوچھا گیا تو علماء کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ اگر عورت کا خاوند زندہ ہے تو وہ اگر طلاق نہ دے تو عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ بعض آدمی کہتے ہیں کہ اگر خاوند گم ہو جائے یا دوسرے ملک میں ہو تو عورت نوّے سال تک اُس کا انتظار کرے۔ اگر نہ آئے تو پھر دوسری شادی کر لے۔ لیکن یہ تو سراسر ظلم ہے۔ وہ عورتیں جو نوجوان ہیں، اُن کا کیا قصور ہے کہ اُن کو نوّے سال تک پابند کر دیا جائے۔ حالانکہ اُس کو یہ بھی علم ہے کہ وہ نہ خاوند سے مل سکتی ہے، اور نہ ہی خاوند اُس سے مل سکتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا، مقبوضہ کشمیر سے نہ ہی کوئی آدمی پاکستان میں

آسکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے۔"

طلوعِ اسلام: چونکہ یہ سوال ایسا ہے جس کا تعلق ہمارے ملک کے قوانین سے بھی ہے، اور اس کا اثر بین الاقوامی سطح پر بھی پڑے گا، اس لئے ہم اس کے لئے کسی رائے کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے لیکن ہم حکومت سے بزور استدعا کرینگے کہ وہ اس کی طرف فوری توجہ مبذول کرے اور اس مسئلہ کا عملی حل تجویز کرے۔ اس کے لئے شاید ہندوستان کی حکومت سے بھی رابطہ قائم کرنا پڑے۔

نقد و نظر

چند معاشی مسائل اور اسلام

محترم سید یعقوب شاہ صاحب (سابق آڈیٹر جنرل. پاکستان) دوران ملازمت شرافت اور دیانت میں اپنی مثال آپ تھے، ملازمت کی اہم ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد (یعنی ریٹائرمنٹ پر) ان کے جذبہ دیانت کی کیفیت کیا تھی، اس کا اندازہ ان الفاظ سے لگائیے جن سے انہوں نے زیر تبصرہ کتاب کی تمہید کا آغاز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ——"جب میرا پنشن لینے کا وقت آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا عمر بھر کا اثاثہ پراویڈنٹ فنڈ کی شکل میں ہے اور اس میں ایک کثیر رقم سود کی شامل ہے۔ چنانچہ مجھے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ میرے لئے یہ رقم حلال ہے یا حرام. جن علمائے کرام سے میں نے رجوع کیا ان میں سے اکثر نے اسے حرام بتایا لیکن دو نے جنہیں برصغیر پاکستان و ہند میں بڑی منزلت حاصل ہے، اسے جائز قرار دیا" —— لیکن انہوں نے جو دلائل دیئے ان سے شاہ صاحب کا اطمینان نہ ہوا تو انہوں نے خود تحقیق کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا اس باب میں کیا حکم (یا منشا) ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کتنے برس اس کوہکنی میں صرف کر دیئے۔ اب کسی کو ان کے نتائج مستخرجہ سے اتفاق ہو یا اختلاف اس باب میں شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ انہوں نے جس جذبہ [illegible] اور متانت شاقہ سے اپنا اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اس کی مثال اس دور میں شاید ہی ملے۔

مسئلہ سود (ربٰو) کے علاوہ انہوں نے بیمہ اور زکوٰۃ سے بھی بحث کی ہے اور اس ضمن میں بھی خاصہ مواد یکجا کر دیا ہے۔

ان ہر سہ مسائل سے متعلق قارئین طلوعِ اسلام ہمارے مسلک سے واقف ہیں۔ یعنی

(۱) ہمارے نزدیک معاوضہ محنت کا ہے۔ سرمایہ پر بڑھوتری کسی شکل میں بھی ہو ربوٰ ہے۔ (شاہ صاحب پیداوار اور بنک کے سود کو جائز قرار دیتے ہیں)

(۲) بیمہ (بہ حالاتِ موجودہ جبکہ قرآن کا معاشی نظام موجود نہیں) نہایت ضروری ہے۔ (شاہ صاحب بھی اسے ضروری قرار دیتے ہیں)

(۳) اسلامی حکومت کی ساری آمدنی۔ زکوٰۃ ہے کیونکہ اس سے افرادِ معاشرہ (اور اس سے آگے بڑھ کر، عالمگیر انسانیت) کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کیا جاتا ہے۔ (شاہ صاحب حکومت کی آمدنی کے اس حصّہ کو زکوٰۃ قرار دینے کے حق میں ہیں ۔۔۔ جسے مصارفِ زکوٰۃ پر خرچ کیا جاتا ہے) ۔۔۔ واضح رہے کہ جن مدات کو عام طور پر قرآن کی رُو سے "مصارفِ زکوٰۃ" کہا جاتا ہے، وہ "صدقات" کے مصارف ہیں۔ قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف کا تعین نہیں کیا۔

ضمناً اس قسم کے تمام مسائل میں اصل دشواری اس سے لاحق ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے احکام، اس کے اپنے معاشی نظام کے اجزا ہیں اور ہم انہیں موجودہ غیر قرآنی معاشی نظام میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ اس میں فٹ نہیں ہوتے تو ہمیں کھینچا تانی کرنی پڑتی ہے۔ اگر قرآن کا معاشی نظام رائج کر لیا جائے تو یہ تمام دشواریاں خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور نے محترم شاہ صاحب کی اس تالیف کو عمدہ سفید کاغذ پر سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ قسم اعلیٰ کی قیمت چھ روپے پچاس پیسے اور عام ایڈیشن کی قیمت پانچ روپے ہے۔

(پرویز)

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن

ہر اتوار کی صبح ۔ ۹ ۔ بجے

اُن کے مکان واقعہ ۲۵ ۔ بی گلبرگ ۔ لاہور میں ہوتا ہے!

خواتین کے لئے پردہ کا الگ انتظام ہوتا ہے

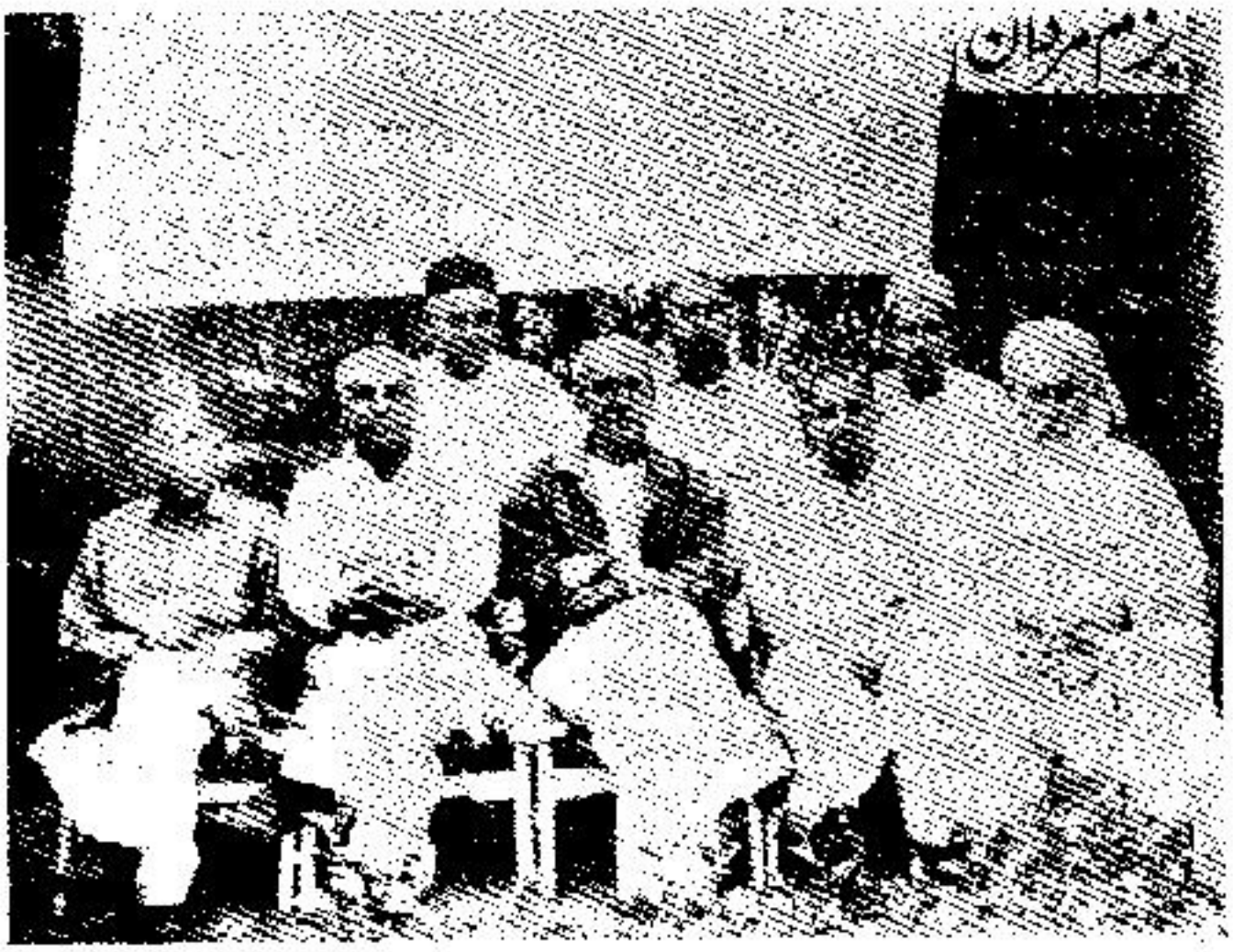

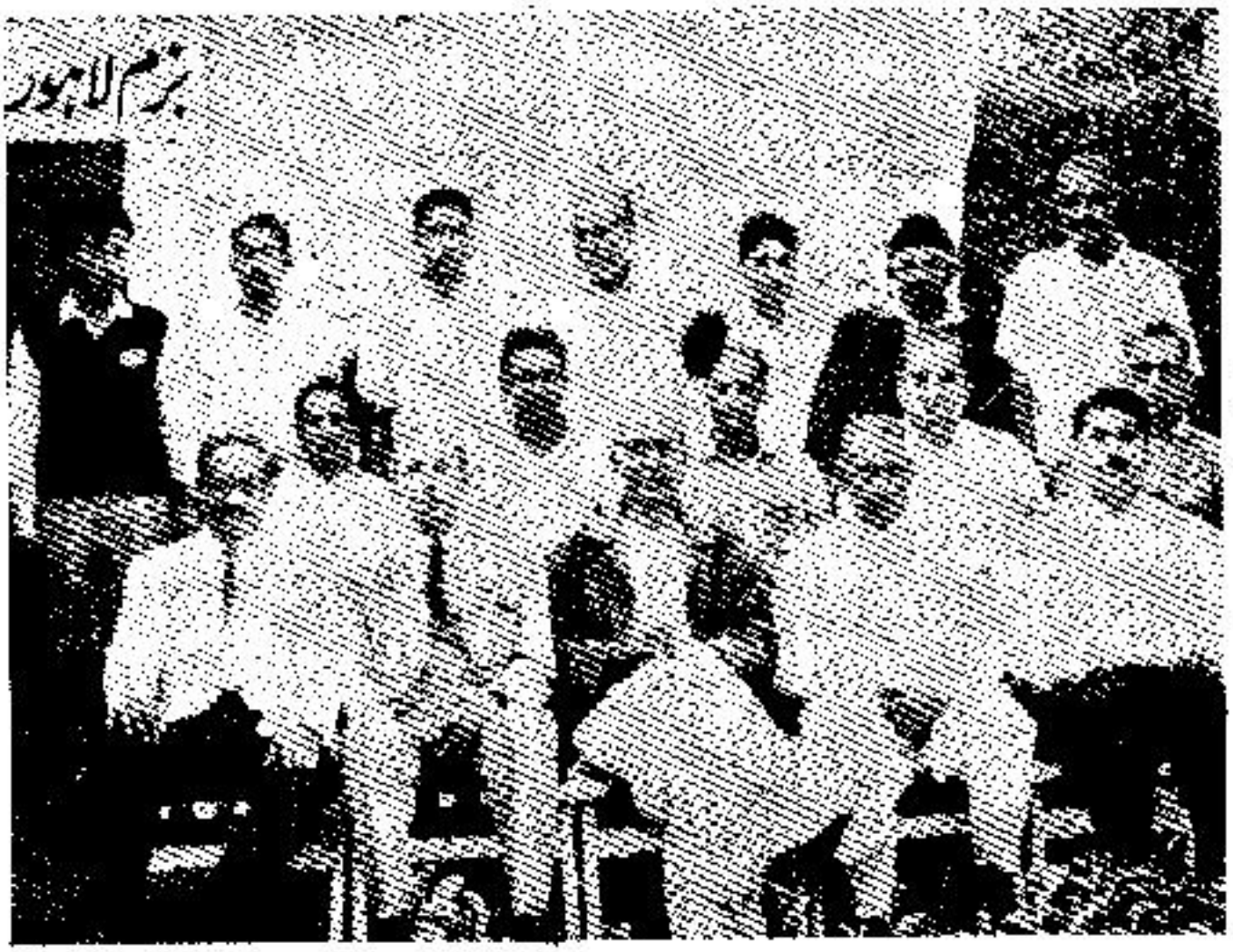
بزم لاہور

بزم کراچی